محمد بن عبدالوہابؒ

ایک مظلوم اور بدنام مصلح

مسعود عالم ندوی

ی اکیڈمی لائلپور

مسعود عالم ندوی

محمد بن عبدالوہاب

ایک مظلوم اور بدنام مصلح

فیصل اکیڈمی، لاہور

طارق ایڈیشن

مئی ۱۹۷۵ء

کتاب : ــــــــ محمد بن عبدالوہابؒ

مصنف : ــــــــ مولانا مسعود عالم ندویؒ

ناشر : ــــــــ محمد سرور طارق

کتابت : ــــــــ احسان الحق

تزئین : ــــــــ سیفی

اہتمام : ــــــــ سعید اقبال طاہر

طباعت : ــــــــ اردو ڈائجسٹ پرنٹرز

تعداد : ــــــــ ۱۱۰۰

قیمت دس روپے

پیشکش

طارق اکیڈمی

سٹریٹ ۳ جھنگ بازار - لائلپور

انتساب

اپنے استاذ، مربی اور مخدوم حضرت مولانا سید سلیمان ندویؒ مدظلہ العالی
کے نام جن کی پدرانہ شفقت میری زندگی کے اتار چڑھاؤ کی نگہبان رہی ہے اور
جن کی سرپرستی اور قیمتی مشوروں نے مجھ میں لکھنے پڑھنے کا مذاق پیدا کیا اور
اپنی طالب علمی کے گزشتہ بارہ تیرہ برسوں میں جن کی ہدایتوں کا یکسر پابند رہا ہوں
اس حقیر طالب علمانہ کوشش کو معنون کرنے کی عزت حاصل کرتا ہوں۔

خاکسار
مسعود عالم ندویؒ

پٹنہ
۲۰ ربیع الآخر ۱۳۶۱ھ

ترتیب

تیسرا باب

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ارمغان

ایک وقت تھا کہ دنیا ظلمت کدہ بنی ہوئی تھی، چہار سو اندھیرے چھائے ہوئے تھے، شرک و بدعت کے اندھیرے، فسق و فجور کے اندھیرے، الحاد و زندقیت کے اندھیرے، ظلم و استبداد کے اندھیرے ——— اور گم گشتہ راہ انسانیت ان بھیانک اندھیروں میں ٹامک ٹوئیے مار رہی تھی۔ خالقِ کائنات سے دکھی انسانیت کی یہ مظلومیت دیکھی نہ گئی، اس کی رحمت جوش میں آئی اور اس نے فاران کی چوٹیوں سے اس آفتابِ جہاں تاب کو طلوع فرمایا، جس کی بدولت تمام اندھیرے چھٹ گئے، دنیا بقعۂ نور بن گئی اور سارا عالم جگمگا اٹھا۔ صلی اللہ علیہ وسلم اس سراج منیر کی ضو افشانیوں کے تو کیا کہنے، اس سے کسبِ فیض کرنے والے چاند ستارے جہاں تہاں گئے، اُجالے بکھیرتے گئے اور ان کے نقشِ پا کی شوخی، قدوم میمنت لزوم کی شہادت دیتی رہی۔ رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین۔

لیل و نہار کی گردش جاری رہی، سورج ہر روز مشرق سے طلوع ہو کر مغرب کے اُفق پر غروب ہوتا رہا اور گیارہ سو سال کا ایک طویل عرصہ گزر گیا، یہ بارہویں صدی ہجری کا آغاز ہے ——— مسلمان بجھے بجھے سے ہیں، وہ مسلمان جنہوں نے دشت و جبل، بحر و بر اور دنیا کے گوشے گوشے کو مطلعِ انوار بنا دیا تھا، آج خود ماند پڑ گئے ہیں، دنیا کی نگاہوں سے اوجھل ہو گئے ہیں اور دنیا پر پھر ایک تاریکی سی چھائی ہوئی ہے اور تو اور سرزمینِ حجاز کی بھی یہی کیفیت ہے، جہاں سے نور کے سوتے پھوٹے تھے۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس انحطاط اور زوال کا سبب کیا تھا؟ سبب صرف یہ تھا کہ مسلمان کتاب و سنت کے دامن کو چھوڑ بیٹھے تھے۔ قرآن کا پیغام تو فضاؤں میں گونج رہا تھا لیکن اس کی طرف کان نہیں لگائے جا رہے تھے، سنت کی روشنی تو بدستور جگمگا رہی تھی، لیکن اس کا کیا کیا جائے کہ اس سے کسبِ ضو

نہیں کیا جا رہا تھا۔ الغرض اب وہ وقت آپہنچا تھا جس کے لیے اللہ کا وعدہ یہ ہے :۔

"ان اللہ یبعث لہٰذہ الامۃ علی راس کل مائۃ سنۃ من یجدد لھا دینھا"	اللہ ہر صدی کے سر پر اس امت کے لیے ایسے لوگ اٹھاتا رہے گا، جو اس کے لیے اس کے دین کو تازہ کریں گے۔

تو کیا آپ جانتے ہیں کہ اس صدی میں قدرت نے جس شخصیت کے سر پر تجدید دین کا تاج رکھا، اسے تاریخ کے صفحات میں ــــــ شیخ الاسلام محمد بن عبدالوہابؒ ــــــ کے نام نامی سے دوام نصیب ہوا ہے اور کیا آپ کو یہ بھی معلوم ہے کہ شیخ الاسلامؒ کی ہی شخصیت تھی جس نے تاریکیوں اور گمراہیوں میں حق کے چراغ روشن کیے، جس نے سرزمین حجاز کے لوگوں کی زندگی، عقائد اور اخلاق میں ایک بار پھر غیر معمولی انقلاب برپا کر دیا، جس نے مسلمانوں کی عظمتِ رفتہ کے حصول تک دن رات ایک کر دیا، جس سے حجاز کے سعودی خاندان نے جہانبانی کے گر سیکھے اور جس کی بدولت علم وفضل کے دبستان کھلے اور ان میں قال اللہ و قال الرسول کی دل آویز صدائیں گونج اٹھیں۔

یہ حالات کی عجب ستم ظریفی ہے کہ مسلمان قوم میں جو شخصیتیں جس قدر عظیم اور محسن ہوئی ہیں، قوم کے بعض نام نہاد افراد نے ان کی شان میں اسی قدر گستاخانہ اور حد درجہ ناشائستہ رویہ اختیار کیا۔ حضرت امام احمد بن حنبل، حضرت امام ابن تیمیہ، حضرت امام مجدد الف ثانی اور حضرت امام محمد اسمٰعیل شہید ــــــ رحمہم اللہ علیہم اجمعین ــــــ کے سوانح حیات کا مطالعہ کرنے والا ہر انسان ہماری بات کی تصدیق کرے گا۔ ان محسن، مصلح اور مجدد شخصیتوں کی طرح شیخ الاسلام امام محمد بن عبدالوہابؒ بھی نہایت مظلوم ہیں۔ شاید ہی کوئی ایسا دن ہو جس میں تکفیر و تضلیل کی توپوں سے آپ پر گولہ باری نہ کی گئی ہو، سب وشتم کے تیر نہ برسائے گئے ہوں، لعن وطعن کے بم نہ چلائے گئے ہوں، دنیا کی وہ کون سی گالی اور دشنام ہے جسے آپ کے خلاف استعمال نہ کیا گیا ہو اور ستم بالائے ستم کہ یہ سب کچھ ان لوگوں کی طرف سے کیا گیا جنہیں

کتاب وسنت کی صحیح خدمت کی کبھی توفیق نہیں ہوئی اور جن کے نازک پاؤں میں راہِ خدا میں کبھی کوئی کانٹا نہیں چبھا۔ کیا دنیا کی تاریخ میں احسان فراموشی کی اس سے بڑھ کر کوئی مثال مل سکتی ہے؟

رکھیو غالبؔ مجھے اس تلخ نوائی میں معاف
آج کچھ درد مرے دل میں سوا ہوتا ہے

حضرت مولانا مسعود عالم ندویؒ کے گہر بار اور سحر کار قلم نے اس عبقری زماں اور نابغہ روزگار شخصیت کی ایمان پرور داستانِ حیات رقم کی تھی، جس کا عنوان تھا محمد بن عبدالوہابؒ۔ ایک بدنام اور مظلوم مصلح —— اس سے دلوں نے جلا پائی تھی، آبلے ٹوٹے تھے، کانٹے نکلے تھے اور ان کے خلاف افترا پردازیوں کے برپا کیے گئے طوفانِ بدتمیزی کی حقیقت طشت ازبام ہوئی تھی الغرض شیخ الاسلامؒ اور ان کی تحریک کے بارے میں اردو زبان میں یہ ایک پہلی اور آخری کتاب تھی۔ مدینہ یونیورسٹی کے چانسلر جناب فضیلۃ الشیخ عبدالعزیز بن عبداللہ بن باز نے اپنی ایک تقریر —— شیخ محمد بن عبدالوہابؒ اور ان کی دعوت —— میں جو یونیورسٹی ہال میں ایک عظیم الشان اجتماع میں کی گئی، اس کتاب کی نہایت تحسین فرمائی ہے۔

یہ گنجِ گراں مایہ، یہ بلند پایہ کتاب ایک عرصہ سے نایاب تھی اور اہلِ علم اس کی تلاش میں سرگرداں۔ لہذا —— طارق اکیڈمی —— اپنے روایتی معیار کے مطابق نہایت سلیقہ سے زیورِ طباعت سے آراستہ کرا کے اس ارمغان کو اہلِ علم کی خدمت میں پیش کرنے کی سعادت حاصل کر رہی ہے۔

اس کتاب پر نگاہِ انتخاب اس لیے بھی پڑی ہے کہ یہ ایک محدّث، مفسرؒ، مصلح، داعی، مجدّد اور ایک عظیم راہنما کی سوانح عمری ہے اور اس بات کی شدید ضرورت ہے کہ نژادِ نو کو اسلاف اور ان کے کارہائے نمایاں سے آگاہ کیا جائے۔ حکیم الامّت علامہ اقبالؒ نے بھی کئی مقامات پر اس طرف توجہ دلائی ہے۔ یہ اسلاف سے بے خبری ہی کا نتیجہ ہے کہ

نئی نسل اغیار سے مرعوب اور متاثر ہے۔ لہذا اسے بتانا چاہیئے کہ ہمارا ماضی کس قدر تابناک ہے!
اور اس طرف توجہ دلانا اس لیے بھی ضروری ہے کہ کل ہم آسمانِ رفعت پر ماہِ شبِ چہار دھم بن کر جگمگا رہے تھے تو آج یہ کیفیت کیوں ہے کہ ؎

وادیٔ نجد میں وہ شورِ سلاسل نہ رہا — قیس دیوانۂ نظارۂ محمل نہ رہا
حوصلے وہ نہ رہے، ہم نہ رہے، دل نہ رہا — گھر یہ اجڑا ہے کہ تو رونقِ محفل نہ رہا

"محمد بن عبدالوہاب، ایک بدنام اور مظلوم مصلح" کے فاضل مصنف حضرت علامہ مسعود عالم ندوی — نوراللہ مرقدہٗ و برد مضجعہٗ — جنہیں ہم سے جدا ہوئے اگرچہ بیس سال ہو چکے ہیں لیکن علمی و ادبی فضاؤں میں ابھی تک آپ کی خوشبو رچی بسی ہوئی ہے۔ آپ ایک بلند پایہ عالمِ دین، صاحبِ طرز انشاء پرداز، محقق، مؤرخ، مصنف اور قوم کا درد رکھنے والے ایک عظیم راہنما تھے۔ عمر شریف کی ابھی صرف تیرہ بہاریں دیکھی تھیں کہ دمہ ایسے مہلک مرض میں مبتلا ہو گئے، جس نے تا زیست پیچھا نہ چھوڑا۔ ساری زندگی علیل رہنے کے باوصف، آپ نے جو علمی، ادبی اور اصلاحی کارہائے نمایاں سرانجام دیئے، انہیں دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ

ایسی چنگاری بھی یارب اپنی خاکستر میں تھی!

خوانندگان کرام کی خدمت میں درخواست ہے کہ آئیے ہاتھ اٹھائیں، سر کو جھکائیں اور مرحوم کے لیے بارگاہِ ایزدی میں دعا کریں، اللھم اغفر لہ وارحمہ وعافہ واعف عنہٗ، اکرم نزلہٗ ووسع مدخلہ واغسلہ بالماء والثلج والبرد۔ آمین

محمد خالد سیف

ڈائرکٹر —— طارق اکیڈمی
سٹریٹ ۲ جھنگ بازار۔ لائلپور

۲۱ ربیع الثانی —— ۱۳۹۵ھ
۵ رمئی —— ۱۹۷۵ء

تَمَتَّعْ مِنْ شَمِيْمِ عَرَارِ نَجْدٍ　　فَمَا بَعْدَ الْعَشِيَّةِ مِنْ عَرَارِ
اَلَا يَا حَبَّذَا نَفَحَاتُ نَجْدٍ　　وَرَيَّا رَوْضِهٖ بَعْدَ الْقِطَارِ
وَاَهْلُكَ اِذْ يَحُلُّ الْحَيُّ نَجْدًا　　وَاَنْتَ عَلٰى زَمَانِكَ غَيْرُ زَارِ

عْرارِ نجد کی بوئے عطر بیز سے لطف اندوز ہونے کا وقت ہے اور شاید آج شام کے بعد عرار (ایک خوشبودار بوٹی) دیکھنا نصیب نہ ہو! بارش کے بعد کے سہانے منظر میں نجد اور اس کے چمن زاروں کے خوشبودار جھونکے بہت دل آویز اور مشامِ جان کو بڑے معطر کرنے والے تھے۔ جب تمہاری قوم نجد میں فروکش تھی، تو وہ دن بھی کیا خوب تھے بلکہ اس قدر خوب تر کہ تمہیں گردشِ ایام کا کوئی شکوہ ہی نہ تھا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تقریب

قدرت کے کارخانے بھی عجیب و غریب ہیں۔ لکھنے والے نے حضرت سید احمد شہیدؒ کی تحریک تجدید و امامت اور ان کے نقشِ قدم پر چلنے والوں کی سرگزشت قلمبند کرنا چاہی اور مرتب ہو گئی، شیخ الاسلام محمد بن عبد الوہابؒ کی سیرت، اس "عجیب و غریب" واقعے کی مختصر سی سرگزشت یہ ہے کہ ۱۹۳۵ء میں دار العلوم ندوۃ العلماء کے دو طالب علموں نے یہ ارادہ کیا کہ حضرت سید احمد شہید بریلویؒ اور مولانا اسمٰعیل شہیدؒ (رحمہما اللہ رحمۃ الابرار الصالحین المجاہدین من عبادہ) کی چلائی ہوئی تحریک تجدید و امامت کی مکمل تاریخ مرتب کی جائے۔ ایک نے حضرت سید صاحبؒ کی سیرت اپنے ذمہ لی اور دوسرے نے بالاکوٹ کے مشہد سے اپنا سفر شروع کرنے کا ارادہ کیا۔

دونوں نے اپنا اپنا کام شروع کیا ان میں جو باہمت، صاحب دل اور سراپا اخلاص و جہاد تھا، اس نے سیرت سید احمد شہیدؒ مرتب کر لی۔ (۱۹۳۹ء) میرا اشارہ اپنے مخلص دوست مولانا ابو الحسن سید علی حسنی ندوی (استاذ تفسیر و ادب دار العلوم ندوۃ العلماء) اور ان کی تصنیف "سیرت سید احمد شہیدؒ" کی طرف ہے جو اہل ذوق کے ہاتھوں میں پہنچ چکی ہے اور ایک قلیل مدت میں اس کے دو ایڈیشن نکل چکے ہیں۔

دوسرے (راقم) نے بھی اپنا کام شروع کیا، لیکن قدم قدم پر رکاوٹیں پیش آئیں۔ نشانِ راہ دھندلا ہو چکا تھا، جاننے والے اور دیکھنے والے ابدی نیند سو چکے تھے۔ سننے والوں پر اب تک ہیبت طاری ہے لیکن قلم کا مسافر اپنی منزل کو نہیں بھولا، تلاش و

جستجو کے ابتدائی نمونے مرحوم "الضیاء" (شعبان ۵۴ھ) میں "الحرکۃ الوهابیۃ السیاسیۃ" کے عنوان سے اور "الہلال" پٹنہ میں "وہابیت ایک دینی اور سیاسی تحریک" کی سرخی کے تحت شائع ہوئے اور مخصوص حلقوں میں پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھے گئے۔

دورانِ بحث وتحیص میں نجد کی وہابی تحریک (جیسا کہ عام طور پر کہا جاتا ہے) کا ذکر بار بار نظر سے گزرا اور ایسی غلط بیانیوں اور افتراء پردازیوں سے دوچار ہوا کہ یارائے ضبط نہ رہا، سب سے بڑی غلط فہمی جس میں دوست اور دشمن دونوں مبتلا ہیں، یہ ہے کہ ہندوستان کی تحریک وہابیت یعنی حضرت سید صاحبؒ کی تحریک تجدید و امامت نجد کی وہابی تحریک ہی کی ایک شاخ ہے۔ اس میں شک نہیں کہ دونوں تحریکوں کا ماخذ ایک اور دونوں کے چلانے والے کتاب وسنت کے علم بردار اور یکساں سرگرم مجاہد تھے لیکن یہ حقیقت اپنی جگہ پر بالکل اٹل ہے کہ ایک کا دوسرے سے دور کا بھی تعلق نہیں۔ یعنی ایک نے دوسرے کی تعلیمات سے بالکل فائدہ نہیں اٹھایا۔ دونوں دعوتیں الگ الگ اپنے مخصوص ماحول اور حالات کے مطابق پھلیں پھولیں۔ اس لیے اصولی اتحاد (یعنی کتاب وسنت کی طرف لوٹنے کی دعوت) کے باوجود دونوں پر اپنے اپنے مخصوص مقامی اثرات کی چھاپ بھی محسوس ہوتی ہے اور ایک دوسرے سے کافی اختلاف بھی رکھتی ہیں۔

ہم نے ابھی کہا کہ نجد کی تحریک دعوت وتجدید کے متعلق ایسی غلط بیانیاں نظر سے گزریں کہ یارائے ضبط نہ رہا اور اسی بے اختیاری میں عاجز نے زیر ترتیب کتاب کے دو حصے کر دیئے۔ شیخ الاسلام محمد بن عبد الوہاب نجدیؒ کی سیرت اور دعوت سے متعلق یہ صفحے اس مجوزہ کتاب کی پہلی جلد کی حیثیت رکھتے ہیں۔ دوسری جلد ہندوستان کی تحریک وتجدید امامت کی مکمل تاریخ پر مشتمل ہوگی، جس میں حضرت سید صاحبؒ کی شہادت (۱۲۴۶ھ/۱۸۳۱ء) سے لے کر ۱۸۷۱ء تک کی تمام سرگرمیوں، قربانیوں اور خدمات کا گہرا جائزہ لینے کی کوشش کی جائے گی۔

اس سلسلہ میں ایک چیز کی وضاحت مناسب معلوم ہوتی ہے۔ "نجدی وہابیت" یا "ہندوستانی وہابیت" کی تاریخ مرتب کرنے سے ہماری غرض اس بات کی تبلیغ نہیں کہ حق و صداقت انہیں دونوں جماعتوں میں محدود ہیں۔ یا یہ کہ مختلف ادبی و مذہبی "اسکولوں" کی طرح، ان جماعتوں کو ہم ایک خاص مشرب یا اسکول کی حیثیت سے پیش کرتے ہیں، ممکن ہے ان جماعتوں کے بعض سرگرم داعیوں یا پرجوش معتقدوں کا ایسا خیال ہو لیکن ہم اس "تحزّب" کو اسلام اور مسلمانوں کے حق میں حد درجہ مضر سمجھتے ہیں۔ ہمارے نزدیک حق صرف کتاب و سنت کی پیروی میں ہے ہم رشد و ہدایت کو کسی فقہی[1] مدرسی یا ملکی جماعت کا اجارہ نہیں سمجھتے۔ یہ نہ نجد کی زرخرید ہے نہ ہندوستان کی۔ اللہ اور اس کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کی تعلیمات واضح اور نمایاں ہیں، جو ان پر ٹھیک ٹھیک چلے گا، وہ ہدایت و فلاح سے شادکام ہوگا۔

نجد اور ہندوستان کی ان دونوں جماعتوں کی تاریخ مرتب کرنے اور دھندلے نقوش کو اجاگر کرنے سے ہمارا مقصد صرف یہ ہے کہ بارھویں تیرھویں صدی ہجری کے دو مشہور مصلحوں اور ان کے نقشِ قدم پر چلنے والوں کی سیرت ہماری آنکھوں کے سامنے آجائے۔ ہم یہ بھی نہیں سمجھتے کہ ان صدیوں میں صرف یہی دو مصلح پیدا ہوئے۔ ہندوستان میں شاہ ولی اللہ دہلویؒ (۱۱۱۴ - ۱۱۷۶) اور طرابلس میں محمد بن علی سنوسیؒ (۱۲۰۲ھ/۱۷۸۷ء - ۱۲۷۶ھ/۱۸۶۰ء) بھی اپنی شانِ تجدید و اصلاح کے لحاظ سے انتہائی ممتاز حیثیت کے مالک ہیں، گو کہنے والے کہیں گے کہ سید صاحبؒ کی دعوت حضرت شاہ صاحبؒ ہی کی پکار کی آواز بازگشت تھی۔ مگر یہ مان لینے کے بعد بھی سید صاحبؒ کا خاص رنگ اور انفرادی خصوصیات اپنی جگہ پر باقی رہتی ہیں۔ اسی طرح اصلاح و تجدید کے دوسرے رنگ میں سید جمال الدین افغانیؒ (ف ۱۳۱۵ھ/۱۸۹۷ء) امیر

---

[1] یعنی ہم حق کو ائمہ اربعہ کی تقلید میں محصور سمجھتے ہیں، نہ دیوبند، ازہر یا ندوہ کے شیوخ اور اکابر کی پیروی میں اور نہ پیشوائی کو کسی خاندان یا ملک کا موروثی حق خیال کرتے ہیں۔

عبدالقادر جزائریؒ (ف ۱۳ھ / ۱۸۸۳) بھی ایک بڑی جماعت کی عقیدت و محبت کا مرکز بنے ہوئے ہیں اور بجا طور پر۔

اسی طرح ہم یہ بھی نہیں سمجھتے کہ نجد اور ہندوستان کی یہ دونوں جماعتیں معصوم ہیں، اور ان سے غلطیاں اور کوتاہیاں نہیں ہوئیں۔ اہل نجد کے بارے میں تو غلو اور شدت کا شکوہ دوستوں کو بھی ہے۔ ہمارا کہنا صرف یہ ہے کہ یہ مخلص جماعتیں تھیں، جو اللہ کے نام پر اٹھیں اور جہاں تک انسانی کوششوں کا تعلق ہے۔ اعلاء کلمۃ اللہ میں انہوں نے کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی۔ آپ اس نظر سے ان کے کاموں کا جائزہ لیجئے سنی سنائی باتوں، دشمنوں اور جاہل مولویوں، اور صوفیوں کے پروپیگنڈے سے متاثر ہو کر غلط رائے قائم کر لینا طالب حق کا شیوہ نہیں ہو سکتا۔

ہم نے اس کتاب میں "رائے زنی" سے مقدور بھر احتیاط برتی ہے۔ امکانی چھان بین اور زیادہ سے زیادہ مستند مآخذ کی بنیاد پر ہم نے حالات و معتقدات کے مرتب کرنے کی کوشش کی ہے، اگر یہ میان ہوئی تو یہ اللہ تعالیٰ کی توفیق سے، ورنہ ایک ہیچ میرز طالب العلم سے غلطیوں اور فروگزاشتوں کا رہ جانا بعید نہیں۔

آخر میں، اللہ تعالیٰ سے التجا ہے کہ نیت و عمل میں اخلاص اور اس حقیر کوشش کو شرفِ قبولیت عطا فرمائے۔ آمین

پٹنہ

۸ رجمادی الاولی ۱۳۶۱ھ

عاجز

مسعود عالم ندوی

عرضِ مؤلف

زیرِ نظر کتاب کی ترتیب کا کام عاجز نے شوال ۱۳۵۹ھ (نومبر ۱۹۴۰ء) ہی میں شروع کر دیا تھا، لیکن ملازمت کی مشغولیت کے باعث زیادہ وقت نہ دے سکتا تھا، تاہم آہستہ آہستہ کام ہوتا گیا اور شوال ۱۳۶۰ھ (نومبر ۱۹۴۱ء) میں کتاب کا خاکہ تیار ہو گیا۔ مگر کتابوں کی کمی کے باعث مسودہ مکمل کرنے کی ہمت نہ ہوئی اور جب کچھ لکھا، تو کچھ اور کتابوں کے ملنے پر کافی اصلاح و ترمیم کی ضرورت پڑی۔ پھر بھی انتہائی تلاش و جستجو کے باوجود بعض ضروری اور اہم کتابیں نہ مل سکیں جن کا ذکر مآخذ کے ضمن میں آگیا ہے۔

جن بزرگوں اور دوستوں نے کتابوں کی فراہمی اور ان کا پتہ دینے میں ہماری مدد کی، ہم ان کے دل سے شکر گزار ہیں۔ اس سلسلے میں خاص طور پر جناب ڈاکٹر عظیم الدین صاحب پٹنہ، پروفیسر سید حسن عسکری، پٹنہ، مولانا عبدالرحمٰن کاشغری ندوی، کلکتہ، مولانا عبدالرحمٰن کاشغری ندوی، کلکتہ، مولانا سید محمد داؤد صاحب غزنوی، لاہور، ڈاکٹر شیخ محمد عنایت اللہ صاحب لاہور، ڈاکٹر محمد حمید اللہ صاحب حیدرآباد، شرف الدین واولادہ، بمبئی، مولانا عبدالمجید صاحب حریری، بنارس، پروفیسر محمد اکبر ندوی، کلکتہ یونیورسٹی، حکیم حافظ یوسف حسن خان صاحب بہار شریف (پٹنہ) کا دلی شکریہ ادا کرنا میرے لیے ایک خوشگوار فریضہ کی حیثیت رکھتا ہے کہ اگر ان بزرگوں اور دوستوں کی مدد نہ ہوتی تو متعدد کمیاب اور نایاب کتابوں کا جمع کرنا میرے لئے بہت دشوار ہوتا۔

اس موقع پر ایک نجدی عالم شیخ محمد عمران بن محمد بن عمران (ساکن ریاض نجد) کا ذکر کرنا بھی ضروری ہے۔ جنہوں نے بمبئی میں اس کتاب کی تالیف کا حال سن کر پہلے سلام محبت سے یاد کیا، پھر بنارس ہوتے ہوئے پٹنہ تشریف لائے اور دو دن غریب خانہ کو رونق بخشی وہ اوسط درجہ کے لکھے پڑھے آدمی تھے، لیکن شیخ ابن عبد الوہابؒ کے ساختہ پرداختہ نجد کے ایک فرد۔ وہی اتباعِ سنت،، وہی تقویٰ وہی جوشِ عمل جو اس جماعت کا طرۂ امتیاز سنتے آئے ہیں، کم از کم ہندوستان میں اس درجہ کے اشخاص بہت کم دیکھنے میں آئے۔ ان سے ہمیں بہت مدد ملی۔ متاخرین علمائے نجد کے سنین وفات کی تعیین انہوں نے اپنے حافظہ سے کی اور پورے یقین کے ساتھ، پھر بھی جہاں کہیں، ہم نے ان کی روایت پر اعتماد کیا ہے، حوالہ دے دیا ہے

کتاب کے مطالعے کے دوران میں مندرجہ ذیل گزارشیں پیشِ نظر رہیں تو راقم کی ممنونیت کا باعث ہوگا۔

(i) حوالوں میں طوالت سے بچنے کے لیے بسا اوقات صرف مصنف کے نام پر اکتفا کیا گیا ہے، کتابوں کی تعیین ماخذ سے ہو سکے گی۔

(ii) ہجری اور عیسوی سنین کے تطابق کی مقدور بھر کوشش کی گئی ہے، لیکن جہاں ٹھیک ٹھیک دن اور ماہ کی تعیین کے ساتھ تاریخ نہیں معلوم ہو سکی ہے، وہاں ہجری سنہ کے مقابلے میں دو عیسوی سنہ دیئے گئے ہیں۔

(iii) جہاں کہیں شیخ الاسلام اور "شیخ" کے لفظ بلا کسی نام کے آئے ہیں۔ وہاں مراد شیخ محمد بن عبد الوہابؒ ہیں، اسی طرح آل الشیخ سے ان کی اولاد احفاد مراد ہیں۔ گو اس جماعت کے لٹریچر میں شیخ الاسلام کا لقب عام طور پر امام ابن تیمیہؒ (ف ۷۲۸ھ) کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔

(iv) عربی اور انگریزی عبارتوں کے ترجمے اور اقتباس میں حرف بہ حرف لفظی ترجمہ کا

التزام نہیں کیا گیا ہے، البتہ اس بات کی پوری کوشش کی گئی ہے کہ اصل کا مفہوم یا اقتباس میں ٹھیک ٹھیک ادا ہو جائے۔

(۷) یورپی اعلام کے تلفظ میں غلطی کا امکان ہے۔ اگر کہیں ایسی چوک یا لغزش نظر آئے تو راقم کو مطلع فرما دیا جائے۔ تصحیح کسی قسم کی بھی ہو، انتہائی شکریے کے ساتھ قبول کی جائے گی۔

پہلا باب

ذاتی حالات

جزیرۃ العرب مسلمانوں کے دورِ عروج میں

عرب کے ریگستانوں نے گو لیل و نہار کے ہزاروں تماشے دیکھے ہیں، مگر شاید اس تماشے سے بڑھ کر کوئی تماشا نہ ہوگا کہ تاریک ذرّوں نے ایک چمکتے سورج (وجودِ نبوی) کے پرتو سے روشن ہو کر ساری دنیا کی آنکھوں کو اپنی چمک دمک سے روشن کر دیا اور خود ان کے گوشہ گوشہ کو مطلعِ انوار بنا دیا اور عین اس وقت جب وہ دشت و جبل اور بحر و بر کو منور کر چکے، خود ایسے ماند پڑ گئے کہ دنیا کی نگاہوں سے اوجھل ہو گئے، یہ کیوں؟ اس لیے کہ ان قوموں نے جو اس نور سے منوّر ہوئیں، یہ سمجھا کہ ان ریگستانی ذرّوں کی تابانی کے مقابلے میں ان کی چمک اور تابانی نگاہوں کو خیرہ نہ بنا سکیں گی، اس لیے ان کا تاریک اور ماند ہی رہنا اچھا ہے[1]۔

یوں تو بنو اُمیّہ کے دورِ حکومت ہی میں حجاز کی مرکزیت ختم ہو چکی تھی، دمشق کے شاطروں نے حرمین کو پیرزادوں کی خانقاہ بنا دی اور پھر ابو مسلم خراسانی کی تلوار نے عربوں کی سیاسی قسمت ہی کا فیصلہ کر دیا (۱۳۲ھ) اور جو عباسی سلطنت اس کے بل بوتے پر قائم ہوئی رفتہ رفتہ عجمی شہنشاہی بن گئی۔ مُعتصم (۲۱۸ھ/۸۳۳ء - ۲۲۷ھ/۸۸۲ء) کے دور میں ترکوں نے زور پکڑا اور پھر تخت و تاج نے ان کے قدم لیے۔ نزدیک اور دور بیسیوں سلطنتیں بنیں اور بگڑیں،

---

[1] سید سلیمان ندوی، معارف نومبر ۲۴ء

پر غریب عرب کا اس تگ و تاز میں کوئی حصّہ نہ تھا۔

مسلمانوں کے عروج کی ان صدیوں میں بغداد اور قرطبہ کی علمی درسگاہیں قائم ہوئیں، ازہر (مصر) زیتونہ (تونس) اور قرویین (فاس) کی مسجدوں سے علم و عمل کے چشمے جاری ہوئے ترکوں نے قسطنطنیہ فتح کیا، سلیمان اعظم (۹۲۶ھ / ۱۵۲۰ء – ۹۷۴ھ / ۱۵۶۶ء) نے وائنا کی دیوار ہلا دی مغلوں نے ہندوستان کو زیر و زبر کیا، لیکن عرب کا شتربان اپنے صحرا میں آرام کی نیند سوتا رہا، عثمانی ترکوں نے حجاز پر صدیوں حکمرانی کی۔ لاکھوں کروڑوں کے چڑھاوے دیئے۔ مصر کے خراج کا بیشتر حصہ حرمین کی خدمت کے لیے وقف رہا۔ مجاوروں اور متولیوں کے لیے بیش قرار وظیفے مقرر کیے۔ پر عرب کی وادی غیر ذی زرع میں کہیں علم کا چشمہ جاری نہ ہُوا۔ دفتروں کی زبان ترکی رہی۔ اللہ اکبر!! خلیفۃ المسلمین کی حکومت اور مہبط وحی میں غیر قرآنی زبان کا چلن! عبرت کا مقام ہے! اس ذلیل دنیا اور بادشاہی نے کیا کیا نہیں کرایا؟ ہاں سرکاری زبان ترکی رہی، افسر ترکی رہے۔ رہے عرب، تو مزاروں کی مجاوری اور گداگری، یا پھر ایام جاہلیت کے نمونے پر لوٹ کھسوٹ ان کا کام رہ گیا تھا۔

محمدّ بن عبد الوہاب رح

بالآخر جب دنیا پھر تاریکی میں مبتلا ہو گئی، مسلمان کتاب و سنّت کا دامن ہاتھ سے چھوڑ بیٹھے۔ ایک اللہ کی جگہ سینکڑوں معبود بنا لیے گئے۔ مصر میں بدوی و رفاعی، عراق و ہند میں عبد القادر جیلی، مکّہ و طائف میں ابن عباس رض یمن میں ابن علوان سے مرادیں مانگی جانے لگیں[1] اور مسلمان ہر شجر و حجر کے آگے جھکنے لگے۔

جب یہ حالت ہو گئی تو پھر اسی بے آب و گیاہ سرزمین پر پہلے پہل تذکیر و ہدایت کا آفتاب ضوفگن ہوا اور خاک عرب کے وہ ذرّے جو جہل و شرک کی طغیانی کے باعث ماند پڑ گئے تھے، پھر چمک اٹھے اور نجد کے چمنستان سے جو اپنے عرار و خزامی[2] کی عطر بیزی کے لیے مشہور رہے

---

[1] تطہیر الاعتقاد عن ادران الالحاد لمحمد بن اسماعیل الامیر الصنعانی ص۱

[2] نجد کے عرار و خزامی کا ذکر عرب میں کثرت سے آتا ہے۔ محمود شکری آلوسی (ف ۱۳۴۲ھ) نے اپنی تاریخ نجد میں اس سلسلے کی منظومات بکثرت نقل کی ہیں، ص ۸-۱۹

توحید و کلمہ حق کی ایسی خوشبو پھیلی، جس نے تمام عالم کو زعفران زار بنا کر چھوڑا۔ میری مراد شیخ الاسلام محمد بن عبد الوہاب (رَحِمَہُ اللہُ وَنَوَّرَ ضَرِیحَہٗ) کی ذاتِ گرامی سے ہے، جنہوں نے اپنی مسلسل اور انتھک کوششوں سے توحید کا بھولا ہوا سبق یاد دلایا اور جہاں تک اس مردِ مجاہد کی آواز پہنچ سکتی تھی، اس نے حق و صداقت کا پیغام پہنچایا۔

ابن عبد الوہابؒ کی پیدائش کے وقت دنیائے اسلام کی حالت

یوں تو اسلامی دنیا کا فکری زوال آٹھویں صدی ہجری کے اختتام پر اپنی آخری حد کو پہنچ چکا تھا۔ اجتہاد و نظر کے دروازے عرصہ ہوا بند ہو چکے تھے۔ متاخرین کے متون و حواشی اور منہیات علماء کے زیرِ درس تھے عملی حالت اس سے بھی زیادہ گری ہوئی تھی لیکن بارھویں صدی ہجری کے آغاز میں یہ انحطاط اس حد کو پہنچ چکا تھا کہ غیر مسلم بھی عہدِ صحابہ کے حالات سے اس دور کے مسلمانوں کا موازنہ کرتے تو انہیں تعجب و افسوس ہوتا۔ امریکی اہل قلم[1] اسٹاڈرڈ کے بیان کے مطابق:۔

"مذہب بھی دیگر امور کی طرح پستی میں تھا تصوف کے طفلانہ توہمات کی کثرت نے خالص اسلامی توحید کو ڈھک لیا تھا مسجدیں ویران اور سنسان پڑی تھیں۔ جاہل عوام ان سے بھاگتے تھے اور تعویذ گنڈے اور مالائیں پھنس کر گندے فقیروں اور دیوانے درویشوں پر اعتقاد رکھتے اور بزرگوں کے مزاروں پر زیارت کو جاتے، جن کی پرستش بارگاہ ایزدی کے شفیع اور ولی کے طور پر کی جاتی تھی، کیونکہ ان جاہلوں کا خیال تھا کہ خدا کی برتری کے باعث وہ اس کی اطاعت بلا واسطہ ادا نہیں کر سکتے۔ قرآن کریم کی تعلیم نہ صرف پسِ پشت ڈال دی گئی تھی بلکہ اس کی خلاف ورزی بھی کی جاتی تھی ...... یہاں تک کہ مقامات مقدسہ (مکہ و مدینہ) بداعمالیوں کا مرکز

---

[1] THE NEW WORLD OF ISLAM ص ۲۶ - ۲۵

بن گئے تھے۔ اور حج جس کو رسول اللہ نے فرائض میں داخل کیا تھا بدعات کی وجہ سے حقیر ہو گیا تھا۔ فی الجملہ اسلام کی جان نکل چکی تھی ...... اگر محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) پھر دنیا میں آتے تو وہ اپنے پیروؤں کے ارتداد اور بت پرستی پر بیزاری کا اظہار فرماتے۔"

ایک غیر مسلم مبصر کے اس تیار کردہ خاکے میں مسلمانوں کے جو خط وخال نظر آتے ہیں، وہ آج بھی بڑی حد تک صحیح ہیں یا نہیں؟ امیر شکیب ارسلان کی رائے میں بڑے سے بڑا دقیق النظر عالم بھی بارھویں صدی کے مسلمانوں کی اس سے زیادہ صحیح اور واضح تصویر نہیں کھینچ سکتا تھا۔[1]

طولِ کلام اگر بار نہ ہو، تو اپنی بدنصیبی کی مزید داستان ایک دوسرے مغربی مبصر کی زبانی بھی سن لیجئے:۔

"اٹھارہویں صدی میں مسلمانوں کا جوش سرد تھا۔ نام نہاد خلیفہ کی ساکھ گر چکی تھی اور مقبوضہ کے جنوب میں اطاعت تسلیم بھی نہیں کی جاتی تھی۔ یمن ایک صدی پہلے یہ جُوا اپنی گردن سے اتار چکا تھا۔ مکہ کے اشراف عیسائیوں کی نسبت اپنے سردار کی مخالفت میں زیادہ سرگرمی دکھانے کو تیار رہتے تھے۔ یہ یکجہتی جو آج دکھائی دیتی اس وقت اس کا احساس بہت کم تھا اور روحانی مرکز مکہ مادی عیش و آرام کا شکار ہو چکا تھا اور تقویٰ و زہد کے علاوہ وہاں ہر چیز کے لیے رواداری موجود تھی۔ حالانکہ ہندوستان میں عیسائیوں کی فتح نگاہوں کے سامنے تھی اور یورپ میں بھی غیر مسلم طاقتیں ترکوں کا پانسہ پلٹ رہی تھیں، لیکن عرب میں ان واقعات کا بہت کم احساس تھا اور یہ عام

---

[1] حاضر العالم الاسلامی ج ۱ ص ۲۶ (حاشیہ)

غیظ و غضب جس کا مظاہرہ آج[1] فرانس، برطانیہ اور روس کے خلاف کیا جا رہا ہے، اس وقت یہ بالکل مفقود تھا۔ جہاں غصہ نہیں وہاں جوش نہیں، چہ جائیکہ تبلیغی کوششیں ہوں۔ (خلاصہ یہ کہ) اس وقت اسلام کا رخ تنزل کی طرف تھا اور یہ تجدد جس کی لہر انیسویں صدی عیسوی میں افریقہ اور چین تک پہنچ کر رہی، اس وقت اس کی پیش بینی نہیں کی جا سکتی تھی[2]۔

نجد ابن عبدالوہابؒ سے پہلے

بارھویں صدی ہجری کے آغاز میں اسلامی دنیا اور مقامات مقدسہ کا جو حال تھا، اس کا ہلکا سا اندازہ اوپر کے بیانات سے ہوا ہوگا لیکن جزیرۃ العرب کے قلب (نجد) کی حالت اور بھی خراب تھی۔ کم سے کم جو کہا جا سکتا ہے، وہ یہ کہ اہل نجد اخلاقی انحطاط میں حد سے گزر چکے تھے اور ان کی سوسائٹی میں بھلائی برائی کا کوئی معیار نہیں قائم رہا تھا۔ مشرکانہ عقیدے صدیوں کے تسلسل سے اس طرح دلوں میں گھر کر چکے تھے کہ ایک بڑا طبقہ انہی خرافات کو دین صحیح کا نمونہ جانتا تھا اور غلط یا صحیح وہ اپنے آباؤ اجداد کی روش سے ہٹنے کے لیے تیار نہیں تھے۔

جبیلہ (وادی حنیفہ) میں زید بن خطاب کی قبر پرستش ہوتی تھی۔ درعیہ میں بھی بعض صحابہ کے نام سے منسوب قبریں اور قبے عوام کی جاہلانہ عقیدت کے مرکز بنے ہوئے تھے۔ وادی غبیرہ میں ضرارؓ بن ازور کا قبہ بدعتوں کی نمائش گاہ بن رہا تھا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ بلیدۃ الفدا میں ایک پرانے درخت کے ساتھ جوان مرد اور عورتیں جو سلوک کرتی تھیں، ان کے بیان سے زبانِ قلم قاصر ہے۔ خلاصہ یہ کہ مایوس عورتیں اولاد کی تمنا میں اس درخت سے ہمکنار ہوئیں۔ نیز درعیہ کے پاس ایک غار تھا جہاں حد درجہ شرمناک برائیاں ہوتی تھیں[3]، الخ

---

[1] ۱۹۰۲ء میں یہ کتاب تالیف ہوئی۔

[2] HOGARTHI : PENETRATION OF ARABIA

[3] نجد کی بدعات کا ذکر تمام تاریخوں میں آتا ہے تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو:۔

(الف) روضۃ الافکار والافہام لمرتاد حال الامام وتعداد غزوات ذوی الاسلام، تالیف

یہ سب کچھ دین اور مذہب کے نام پر ہوتا تھا اور جو دو چار اشخاص فقہ و حدیث سے بہرہ ور تھے وہ اپنے میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی ہمت نہیں پاتے تھے، آخر علماء سے الگ تو تھے نہیں !!

سیاسی حالت اور خراب تھی۔ خانہ جنگی اور بدحالی عام تھی، شمالی نجد (جبل شمر) قبیلہ طے اور حسا میں بنو خالد کا زور تھا اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ عیینہ کی امارت حسّا کے بنو خالد کا اقتدار مانتی تھی۔ درعیہ میں قبیلہ عنزہ کے قدم جم رہے تھے۔ درعیہ سے قریب منفوحہ میں دواس کی الگ امارت قائم ہوگئی تھی، نجد کا چھوٹا سا علاقہ چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں بٹا ہوا تھا۔[1]

(بقیہ حاشیہ ص ۲۶) شیخ حسین بن غنام (ف ۱۲۲۵ھ) ص ۱۶-۷۔

(ب) عنوان المجد فی تاریخ نجد ص ۶ تالیف عثمان بن بشر النجدی (ف ۱۲۸۸ھ) یہ دو کتابیں تاریخ نجد پر اُمّ اور اصل کا حکم رکھتی ہیں۔

(ج) الہدیۃ السنیۃ والتحفۃ الوہابیۃ النجدیۃ، مرتبہ سلیمان ابن سحمان (ص ۹-۴۷) نیز تبرئۃ الشیخین الامامین مؤلفہ سلیمان بن سحمان (ص ۱۶۳-ص ۱۶۱)

(د) ARABIA (دی ماڈرن ورلڈ سیریز) ص ۵-۴، فلبی اور ابن سحمان کا ماخذ بھی ابن غنام ہی کی کتاب ہے۔

[1] فلبی: ص ۷-۶ : عرب کے مختلف حصّوں اور خاص کر نجد کا جغرافیہ ذرا مشکل سے سمجھ آتا ہے۔ ہمارے ہاں جیسی صوبہ اور ضلع وار مرتب تقسیم ان کے ہاں نہیں ہے اور نہ موجودہ دَور سے پہلے ملک میں کوئی قابلِ ذکر سیاسی وحدت تھی۔ مختصر طور پر یوں سمجھیے کہ نجد کے تین بڑے بڑے حصّے ہیں:-

(۱) شمال مشرقی حصہ جس کا نام شمّر ہے، اس کے مشہور شہر حائل اور القصر ہیں۔

(۲) شمالی مشرقی حصہ جس کا نام القصیم ہے، اس کے مشہور مقامات عنیزہ اور بریدہ ہیں۔

(۳) جنوبی حصّہ جو العارض کہلاتا ہے، اس کا مشہور شہر ریاض ہے، جو آج سعودی حکومت کا پایۂ

خاندان

اس پُر آشوب دور اور ناموافق ماحول میں محمد بن عبدالوہابؒ نے آنکھیں کھولیں عینیہ[1] کے ایک علمی گھرانے میں پیدا ہوئے[2] (۱۱۱۵ھ ۱۷۰۳ء) ان کے جد امجد سلیمان بن علی بن مشرف (ف ۱۰۷۹ھ) اپنے زمانہ کے مشہور عالم اور علمائے نجد کے مرجع وماویٰ تھے مناسک میں ان کی کتاب مشہور ہے اور "السحب الوابلہ" کے بیان کے مطابق مناسک کے طور

(بقیہ حاشیہ ص ۲۷) تحت ہے۔ عارض کو جبل یمامہ بھی کہتے ہیں، اصل میں یہ ایک پہاڑی کا نام ہے اور اس کے گرد ونواح کی زمین وادی حنیفہ اور یمامہ کہلاتی ہے، شیخ الاسلامؒ کی جائے پیدائش عینیہ اور دعوت کا مرکز درعیہ دونوں اسی وادی میں واقع ہیں جو نجد کے قلب کی حیثیت رکھتے ہیں۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو انسائیکلو پیڈیا آف اسلام لفظ ARABIA ج ۱ ص ۳۷۱ اور (ABJA) ج ۳ ص ۶-۸۹۳

[1] عُیَینَہ (بضم عین) عین (چشمہ کے معنی میں) کی تصغیر ہے اور اب اسے بار الشیخ بھی کہتے ہیں۔

[2] ابنِ غنام: ج ص ۳۰، عنوان المجد جلد ۱ ص ۱۳۸۔ بعد کے لکھنے والوں میں احمد بن زینی دحلان (الدرر السنیۃ ص ۴۲: خلاصۃ الکلام ص ۲۲۹) نے ۱۱۱۱ھ اور امیر شکیب (حاضر ج ۴ ص ۱۶۱) نے ۱۱۱۶ھ تاریخ ولادت بتلائی ہے، جو غلط ہے اسی طرح HUGES (ڈکشنری آف اسلام ص ۶۵۹) ولفریڈ بلنٹ (اے پلگریمیج ٹو نجد (ضمیمہ) صفحہ ۲۵۱) ازوبیر ARABIA THE CRADEL OF ISLAM وغیرہم نے تاریخ ولادت ۱۶۹۱ء لکھی ہے جو یکسر غلط ہے۔ ہوگارتھ (ص ۷۳) نے بھی سال ولادت غلط (۱۶۹۶ء) دیا ہے اور انہیں ماخذوں کی پیروی میں اپنے بھی ٹھوکر کھاتے ہیں۔

[3] - (الف) شیخ کا پورا نسب نامہ یہ ہے:-

محمد بن عبدالوہاب بن سلیمان بن علی بن محمد احمد بن راشد بن برید بن مشرف الخ

(ب) السحب الوابلہ علی ضرائح الحنابلۃ (مخطوطہ مشرقی کتاب خانہ پٹنہ) میں اس خاندان کے مندرجہ ذیل افراد کے حالات ملتے ہیں۔

پر حنابلہ اسی پر اعتماد کرتے ہیں (ص ۱۰۳) ان کے چچا ابراہیم بن سلیمان بھی ممتاز عالم تھے۔ ابراہیم کے بیٹے عبدالرحمٰن (ف ۱۲۰۶ھ) بھی فقیہ و ادیب تھے۔ شیخ کے والد عبدالوہاب ابن سلیمان رح (ف ۱۱۵۳ھ) بھی فقہ میں دخل رکھتے تھے اور ایک عرصہ تک عینیہ اور حریملا میں عہدۂ قضاء پر مامور رہے۔ سلیمان بن عبدالوہاب رح (ف ۱۲۰۸ھ) اور ان کے فرزند عبدالعزیز (ف ۱۲۶۳ھ) بھی ممتاز علمی حیثیت کے مالک تھے۔ ۱۲۳۶ھ میں مصری غارتگری کے وقت وہ حریملا میں موجود تھے، محبوس کیے گئے اور طرح طرح کی سختیوں سے دوچار ہوئے۔ ان کا کتاب خانہ نذرِ آتش کیا گیا اور مال و اسباب لوٹ لیا گیا۔[1]

نشوونما

محمد بن عبدالوہاب رح آغازِ طفولیت ہی سے ذہانت اور قوتِ حافظہ میں ممتاز تھے۔ دس برس کی عمر سے پہلے قرآن مجید کے حفظ سے فارغ ہو گئے۔ اپنے والد سے فقہ حنبلی کی کتابیں پڑھیں اور بچپن ہی میں حدیث و تفسیر کی کتابیں کثرت سے مطالعہ کیں۔ ان کے والد عبدالوہاب رح ہونہار لڑکے کی ذہانت اور استعداد سے متعجب ہوتے۔ ان کا بیان ہے کہ محمد کی تدریس کے دوران میں وہ خود بھی اپنے ہونہار بچے کی ذہانت اور وسعتِ معلومات سے مستفید ہوئے۔ شیخ عبدالوہاب اپنے بیٹے کے علم سے اس قدر متاثر تھے کہ نوعمری کے باوجود انہیں امامت کے لیے آگے بڑھاتے۔ کم سنی میں شادی ہوئی اور فریضۂ حج سے مشرف ہوئے۔ مدینہ منورہ میں دو ماہ قیام کے بعد عینیہ واپس ہوئے اور اپنے والد ماجد سے تحصیلِ علم میں مصروف ہو گئے۔ یادداشتیں اور علمی کتابیں نقل کرنے میں اتنی محویت ہوئی کہ ایک ایک نشست میں بیس بیس صفحے لکھ جاتے۔[2]

(بقیہ حاشیہ ص ۲۸) ۱۔ سلیمان بن علی بن مشرف (ص ۱۰۳)

۲۔ ابراہیم بن سلیمان بن علی (ص ۸۰۹)

۳۔ عبدالوہاب بن سلیمان بن علی، سلیمان بن عبدالوہاب، عبدالعزیز بن سلیمان (ف ۱۲۶۳ھ) ص ۱۷۱-۲

۴۔ عبدالوہاب بن عبداللہ بن عبدالوہاب بن مشرف (ف۔ ۱۱۲۵ھ ص ۱۷۲)

[1] عنوان ج ۱ ص ۲۳۶ [2] ابن غنام ص ۳۰۔

علم کی راہ میں

ابن عبد الوہابؒ قدرت کی طرف سے غیر معمولی حساس دل لے کر آئے تھے۔ اپنے ارد گرد نجد کے شہروں اور بستیوں کی حالت دیکھ دیکھ کر کبیدہ خاطر ہوتے۔ عام لوگوں کا تو ذکر ہی کیا، خود اہلِ علم کی حالت ناگفتہ بہ تھی۔ محمد اپنے والد عبد الوہاب سے، جو نجد کے علماء میں ممتاز تھے، جو کچھ حاصل کر سکتے تھے، اس میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی، لیکن ہونے والے مصلح اور مجدد کی پیاس دو چلو پانی سے کس طرح بجھ سکتی تھی؛ حج سے مشرف ہو چکے تھے، حجاز کی مرکزیت دل میں گھر کر چکی تھی۔ طلبِ علم کا خیال آتے ہی حجاز کا ارادہ ہوا۔ پُرجوش نوجوان کی عمر کوئی بیس برس کی ہو گی کہ لیلائے علم کے شوق میں اس نے دشت نوردی کی ٹھانی اور حجاز کا رُخ کیا۔[1]

دوبارہ حج بیت اللہ اور مسجد نبوی کی زیارت سے مشرف ہو کر علماء کی خدمت میں حاضر ہوئے اور تحصیل علم میں منہمک ہو گئے۔ خاص طور پر نجد کے مقام مجمعہ کے ایک مشہور عالم عبد اللہ ابن ابراہیم بن سیف (جو جوارِ رسولؐ میں جا کر بس گئے تھے) کی صحبت سے مستفیض ہوئے۔ شیخ عبد اللہ بن ابراہیم (مدنی)[2] کی جلالتِ قدر اور اخلاص کا اندازہ اس روایت سے ہوتا ہے جو خود شیخ محمد بن عبد الوہابؒ کی زبانی منقول ہے۔ شیخ کہتے ہیں:۔

"میں ایک دن ان کے پاس بیٹھا ہوا تھا، کہ انہوں (عبد اللہ بن ابراہیم) نے فرمایا "تمہیں وہ ہتھیار دکھاؤں، جو میں نے اہلِ مجمعہ کے لیے تیار کیا ہے"؛ میں نے کہا "ضرور"۔ تو مجھے وہ ایک کمرے میں لے گئے جہاں

---

[1] یہ تقریباً ۱۱۳۵ھ کا واقعہ ہے۔

[2] عبد اللہ بن ابراہیم بن سیف اپنے وقت کے مشہور فقیہ تھے، شام جا کر مشہور حنبلی عالم شیخ ابو المواہب حنبلی (ف ۱۱۲۶ھ) سے استفادہ کیا۔ ان کے بیٹے ابراہیم بن ابراہیم (ف ۱۱۸۵ھ) بھی مشہور عالم تھے۔ ان کی کتاب "العذب الفائض فی شرح الفیۃ الفرائض" مشہور ہے (السحب الوابلہ: ص ۱۲-۱۱)

کتابوں کا انبار تھا اور بولے "ہم نے ان لوگوں کے لیے یہی ہتھیار فراہم کیے ہیں[1]۔"

شیخ عبداللہ بن ابراہیم ہی کے توسط سے شیخ محمد حیات سندھی[2] (ف ۱۱۶۵ھ) سے تعارف حاصل ہوا جو اس وقت مدینۃ الرسول میں حدیث و سنت کے مسلّم استاذ تھے، ابن عبدالوہاب ان کے مخصوص شاگردوں کے حلقہ میں داخل ہو گئے اور عرصہ تک خدمت میں حاضر رہے۔ اسی سلسلہ میں شام کے نامور عالم شیخ علی داغستانی (ف ۱۱۹۹ھ) سے بھی ابن عبدالوہاب کی شاگردی کا ذکر کیا جاتا ہے، جو قرین قیاس معلوم نہیں ہوتا[3]۔ اسی طرح مدینہ منورہ کے مشہور محدث محمد بن سلیمان کردی مدنی (ف ۱۱۹۴ھ) سے بھی استفادہ کا ذکر بعض تاریخوں میں آتا ہے۔ لیکن مستند اور معاصر تاریخوں کی خاموشی کے علاوہ سنین اور واقعات بھی اس کے خلاف شہادت دیتے ہیں[3]۔

استاذ محترم مولانا سید سلیمان ندوی مدظلہ (سلاطین نجد کا مذہب، معارف نومبر ۲۴ء) نے حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ (ف ۱۱۷۶ھ) اور شیخ الاسلامؒ دونوں کا منبع فیض ایک مسجد

---

[1] عنوان ص ۷

[2] عنوان المجد: ۱، ۲۵ سلک الدرر: ۴، ۳۴)

[3] شیخ علی داغستانی اپنے عہد کے علمائے دمشق میں ممتاز درجہ رکھتے تھے۔ مدینہ منورہ میں ایک عرصہ تک قیام پذیر رہے۔ شیخ محمد حیات سندھی سے روایت حدیث کی اور بیسیوں ان سے مستفید ہوئے ۱۱۲۵ھ میں پیدا ہوئے، مدینہ منورہ تحصیل علم کو آئے اور ایک مدت وہاں قیام مدینہ منورہ میں ان کی عمر بہت کم رہی ہوگی، اس لیے ان سے شیخ کا مستفید ہونا قرین قیاس نہیں۔ معاصرین میں محب الدین خطیب (الزہراء:۔ رجب ۴۵ھ اور محمد حامد فقی (اثر الدعوۃ الوہابیۃ فی الاصلاح الدینی: ص ۴۷) نے اس کا ذکر کیا ہے۔

نبوی) بتایا ہے۔ اصلی سرچشمہ (کتاب وسنت) کے اتحاد کے ساتھ ساتھ درس گاہ (مسجد نبوی) کے ایک ہونے میں بھی شبہ نہیں، لیکن استاذ کی شرکت کا پتہ نہیں چلتا۔

لیب بتنونی (الرحلة الحجازيه : ص ۸۷) نے مکہ مکرمہ میں تحصیل علم کا ذکر کیا ہے۔ لیکن کسی مستند روایت سے اس کی تائید نہیں ہوتی۔

مدینہ منورہ سے شیخ نے بصرہ کا قصد کیا اور وہاں شیخ محمد مجموعی سے حدیث ولغت کا درس لیا اور ان کی خدمت میں برابر حاضر ہوتے رہے۔ ابن بشر نے اپنے استاذ عثمان بن منصور ناصری سے روایت کی ہے کہ شیخ محمد مجموعی کی اولاد بھی علم وعمل میں ممتاز حیثیت رکھتی تھی[1] شام کا بھی[2]

(بقیہ حاشیہ ص ۳۱) [3] ابن غنام اور ابن بشر نے محمد بن سلیمان کردی کی شاگردی کا ذکر نہیں کیا۔ حضرت احمد زینی وحلان (الدرالسنیۃ : ۴۲، ۳۵) نے شیخ کُردی کی شاگردی کا ذکر کیا ہے اور بڑے زور وشور سے وحلان کی اس کتاب اور "خلاصۃ الکلام فی امراء البلد الحرام" میں اس درجہ غلط بیانیاں بلکہ افتراء پردازیاں ہیں کہ اس غیر مصدقہ روایت پر بھی یقین کرنے کو جی نہیں چاہتا۔ مزید یہ کہ سنین کی شہادت بالکل خلاف ہے۔ محمد بن سلیمان کردی ۱۱۹۴ھ میں سرسٹھ سال کی عمر پاکر فوت ہوئے (سلک الدرر ۴، ۲، ۱۱۱) تو گویا ان کی ولادت ۱۱۲۷ھ کے لگ بھگ ہوئی ہوگی۔ اس طرح پر شیخ کے زمانہ تحصیل میں یہ بھی بالکل نوعمر ہوں گے اور ان سے شیخ کا مستفید ہونا قرین قیاس نہیں۔

[1] عنوان المجد ص ۸

[2] مارگولیوتھ (انسائیکلوپیڈیا آف اسلام : ع ۹، ۸۶، ۱) نے تو افتراء پردازیوں کی انتہا کردی ہے، وہ کہتا ہے۔

"بغداد میں شادی کی جو دو ہزار دینار چھوڑ کر مری ...... کردستان ہمدان قم اصفہان کی زیارت کی اور قیام کیا۔"

اس کے علاوہ BRYDGES نے A BRIEF HISTORY OF WAHKABY

ارادہ رکھتے تھے۔ لیکن زاد راہ کی کمی کے باعث کامیاب نہ ہوئے اور احسا ہو کر حریملا (نجد) لوٹ آئے۔ جہاں ان کے والد ۱۱۳۹ھ/۱۷۲۶ء میں عینیہ سے منتقل ہو چکے تھے۔

دعوت و تبلیغ

ابن عبدالوہابؒ بچپن ہی سے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی طرف مائل تھے۔ ابھی وہ عینیہ میں فقہ و حدیث کی ابتدائی تعلیم حاصل کر رہے تھے کہ بدعات ان کی آنکھوں میں کھٹکنے لگے اور جہاں کوئی عمل اصول دین کے خلاف پاتے فوراً نہی عن المنکر کے فرض سے سبکدوش ہونے کی کوشش کرتے۔

مدینہ منورہ میں حیات سندھیؒ اور علی بن ابراہیم بن سیف نجدیؒ سے استفادہ کے بعد حدیث پر نظر ہوئی اور پھر چاروں طرف آنکھ اٹھا کر دیکھا تو انہیں دنیا گمراہی کی سیاہ چادر میں لپٹی ہوئی نظر آئی۔ جہاں تک پتہ چلتا ہے، شیخ نے سب سے پہلے اسی زمانہ میں "استغاثہ" کے خلاف آواز بلند کی۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر اطہر کے پاس جاہلوں کی حرکتیں دیکھ دیکھ کر ان سے ضبط نہ ہو سکا۔ ایک مرتبہ وہ حجرۂ نبوی کے پاس کھڑے تھے اور سامنے بدعات کا بازار گرم تھا۔ اتنے میں ان کے استاد محمد حیات سندھیؒ آ گئے، شیخ نے پوچھا: "ان لوگوں کے متعلق آپ کیا کہتے ہیں؟" استاد نے جواب دیا: اِنَّ هٰٓؤُلَآءِ مُتَبَّرٌ مَّا هُمْ فِيْهِ وَ بَاطِلٌ مَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ[1]

بصرہ میں یہ جذبہ اور تیز ہو گیا۔ نہی عن المنکر بلا خوف کرتے، جس کی پاداش میں انہیں طرح طرح کی تکلیفیں جھیلنا پڑیں اور آخر بصرہ چھوڑنا پڑا۔ یہی نہیں بلکہ ان سے تعلق اور ہمدردی کے جرم میں شیخ محمد مجموعی کو بھی ستایا گیا۔ بدبختوں نے انہیں ٹھیک دوپہر کے وقت نکالا۔ بیچارے اسی حال میں زبیر[2] کی طرف جا رہے تھے کہ راستے ہی میں پیاس کے مارے

---

[1] عنوان المجد ص ۷۔ [2] زُبَیر: بصرہ سے قریب ایک قصبہ ہے جو حضرت زبیر بن عوامؓ کے نام پر آباد ہے۔ اس کے باشندے اس وقت بھی اتباع سنت میں ممتاز ہیں۔

حلق میں کانٹے پڑ گئے۔ آخر ایک باخدا انسان ابو حمیدان نامی نے جو کرائے کے گدھے رکھتا تھا دستگیری کی اور پیاس بجھائی، نیز اپنے گدھے پر سوار کر کے زبیر پہنچا دیا۔[1]

یہ سب دعوت کی ابتدائی منزلیں تھیں اور تمہیدی کام تھے۔ حریملا واپسی کے بعد انہوں نے بدعات کے استیصال اور توحید و اخلاق کے عام کرنے کا مصمم ارادہ کرلیا۔ دعوت کی بنیاد توحید کی پاکیزگی پر رکھی اور عبادت کسی قسم کی ہو، صرف اللہ تعالیٰ کی ذات کے ساتھ مخصوص کرنے پر زور دیا۔ کلمہ لا الٰہ الا اللہ کا بول بالا، ان کا شعار تھا۔ صدیوں کے بگڑے ہوئے اخلاق کی اصلاح کا بیڑا اٹھانا کوئی بچوں کا کھیل نہیں۔ وہ بدوؤں سے چوری، رہزنی، مکاری لوٹ مار کی بری عادتیں چھڑا کر ان میں راست بازی اور ہمدردی کے جذبات پیدا کرنا چاہتے تھے۔ جاہلوں کے غلط عقیدوں کی اصلاح معبودانِ باطل قبہ و قبر سے ہٹا کر پھر معبودِ حقیقی کی درسگاہ میں لا کھڑا کرنا ان کا مقصود تھا۔ پھر یہ کس و ناکس کے بس کی بات نہ تھی۔ اس کے لیے ایمانِ خاص اور سچی عزیمت کی ضرورت تھی۔ اس راہ میں شیخ کو جن صبر آزما مصیبتوں سے دوچار ہونا پڑا اور جس خندہ پیشانی کے ساتھ انہوں نے اس راہ کی تکلیفوں کا استقبال کیا، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ان اوصاف سے پوری طرح متصف تھے۔

توحید کی دعوت دی، غیر اللہ کے آگے سرخم کرنے، قبروں، ولیوں سے مدد مانگنے نیکوکار بندوں کو معبود ثانی بنانے سے روکنے کی کوشش کی۔ قبروں کی زیارت میں مسنون طریقہ کے خلاف جو بدعتیں رائج ہو گئی تھیں، ان کے مٹانے کو عملی قدم اٹھایا۔ بس پھر کیا تھا، مخالفت کا سیلاب امنڈ آیا۔ اعزہ و اقربا درپے آزار ہو گئے۔ خود باپ کو بھی یہ ادا پسند نہ آئی شیخ نے باپ کے ادب اور استاذ کی عزت کا پورا لحاظ رکھا، پر جو قدم آگے بڑھ چکا تھا، وہ پیچھے نہ ہٹا۔ ایذا رسانی حد سے بڑھ گئی، پر صبر و عزیمت کا کوہِ وقار اپنی جگہ سے نہ ٹل سکا۔ تمام

---

[1] عنوان المجد: ص ۸

رکاوٹوں کے باوجود انہوں نے اپنی دعوت و تبلیغ کا سلسلہ جاری رکھا اور عارض کے تمام قصبات حریملا، عیینہ، درعیہ، ریاض وغیرہ میں ان کی شہرت پھیل گئی اور تعلیمات کی اشاعت ہونے لگی۔

تبلیغ کا سلسلہ جاری تھا، لیکن والد ماجد کی سرد مہری[1] کے باعث رفتار سست تھی۔

۱۱۵۳ھ / ۱۷۴۰ء میں والد کا انتقال ہوا، تو پھر دعوت و تبلیغ میں گرمی پیدا ہو گئی۔ علی الاعلان اتباعِ سنت اور ترکِ بدعات کا وعظ کہنے لگے، حریملا کے کچھ لوگ متاثر ہوئے اور تحریک کے پُرجوش معاون بن گئے۔ شیخ کے درس میں حاضر ہونے لگے اور ان کے مواعظ سے مستفید ہوئے شیخ کی مشہور تالیف کتاب "التوحید" اسی دوران میں تالیف ہوئی[2]۔

عیینہ میں ۱۱۵۷ھ / ۱۷۴۴ء

دعوت و تبلیغ کی ابتدائی منزلیں طے کرنے پر شیخ کو احساس ہوا کہ اس افراتفری میں کہ ہر ناحیہ[3] کا حاکم الگ ہے۔ کامیابی دشوار ہے، خود حریملا میں دو خاندان (قبیلہ) سرداری کے لیے دستِ گریباں تھے[4] ان حالات میں کوئی مؤثر قدم اٹھانا مشکل تھا۔ انہوں نے پورے نجد کو ایک امیر اور

---

[1] محمد حامد فقی (ص ۵۱) نے شیخ عبدالوہابؒ کو غیر جانبدار بتایا ہے۔

[2] روضۃ الافکار ص ۳۶

[3] عثمانی حکومت کے دور میں انتظامی آسانی کے خیال سے ملک کی تقسیم چار حصوں میں کی جاتی تھی۔

"ولایۃ (صوبہ) لواء (کمشنری) قضاء (ضلع) ناحیہ (تحصیل)، (سب ڈویژن)

عارض کا شمار ناحیہ میں تھا، آلوسی نے ناحیۃ العارض لکھا ہے، (صوبہ ضلع کی دیسی اصطلاحیں ہم نے مقابلہ کے لیے دی ہیں)

[4] عنوان المجد (ص ۹) میں بعض غلاموں کی شرارت کا ذکر ہے، جو شیخ کے قتل کا ارادہ رکھتے تھے، دوسری کتابوں میں جہاں کہیں بھی اس کا ذکر ہے، غالباً ماخذ یہی ہے۔

ایک جھنڈے کے نیچے جمع کرنے کا ارادہ کر لیا۔ وہ سمجھتے تھے کہ کسی امیر (حاکم صاحبِ نفوذ و قوت) کی ہمدردی حاصل کیے بغیر دعوت کو دور و نزدیک جلد از جلد پھیلانا آسان نہیں۔ ان خیالات کے پیشِ نظر انہوں نے عثمان بن معمر امیر عینیہ سے خط و کتابت کی اور امیر کو قبولِ حق پر آمادہ پا کر خود بھی عینیہ منتقل ہو گئے۔ امیر نے اچھی طرح آؤ بھگت کی اور شیخ کو سر آنکھوں پر بٹھایا، جوہرہ بنت عبداللہ بن معمر سے شیخ کی شادی ہوئی جس سے ظاہری طور پر تعلقات مستحکم ہو گئے۔ شیخ کے سامنے ایک متعین مقصد تھا۔ ذاتی اور خاندانی تعلقات حصولِ مقصد کا ذریعہ ہو سکتے تھے، خود مقصد نہیں تھے۔ انہوں نے امیر عینیہ کے سامنے دعوت پیش کی، توحید کا مفہوم واضح کیا اور اس جلیل القدر مہم میں امداد و تعاون کی درخواست کی۔ شیخ کے یہ الفاظ یادگار اور قابلِ نقل ہیں۔

انی ارجو ان انت قمت بنصر لا الٰہ	اگر تم لا الٰہ الا اللہ کی امداد کو آمادہ ہو جاؤ تو میں
الا اللہ ان یظہرک اللہ تعالیٰ و	امید کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ تمہیں غالب کرے گا
تملک نجداً واعرابہا۔[1]	اور نجد اور اہلِ نجد کی باگ تمہارے ہاتھوں میں ہو گی

عثمان کو یہ پیشکش صدقِ دل سے کی گئی تھی، پر افسوس کہ وہ اس پر قائم نہ رہا، جس کا خمیازہ اسے بھگتنا پڑا اور آخرکار یہ نعمت عینیہ سے درعیہ منتقل ہو گئی۔ بہرحال عثمان بن معمر نے وعدہ کیا اور اس کی معاونت کے سہارے شیخ نے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی کھلم کھلا دعوت دینا شروع کی اور رفتہ رفتہ اہلِ عینیہ کے دل قبولِ حق کی طرف مائل ہونے لگے۔

شیخ نے اس اثناء میں بدعات کے بعض اڈوں کے ختم کرنے کا بیڑا اٹھایا، جس میں انہیں خاطر خواہ کامیابی ہوئی۔ اس علاقہ میں بعض درختوں کی توقیر کی جاتی تھی، انہیں بیخ و بن سے اکھاڑ پھینکا۔ زید بن خطابؓ (جو یوم یمامہ میں شہید ہوئے تھے) کے نام سے مقام جبلیہ

---

[1] عنوان ص ۹

میں ایک قبہ تھی اور اس کا بھی خاتمہ کیا ، جو اس وقت کے لحاظ سے کوئی آسان کام نہیں تھا - ابنِ بشر اس قبہ کے انہدام کا واقعہ اس طرح بیان کرتا ہے :-

"شیخ نے عثمان سے کہا: "آؤ اب اس قبہ کو منہدم کر دیں جس کی بنیاد باطل پر رکھی گئی ہے اور جس کی وجہ سے لوگ راہِ ہدایت سے بھٹک گئے ہیں"۔ عثمان نے کہا آپ ہی اسے ہدم کر دیں۔ "شیخ نے فرمایا کہ ہمیں اہلِ جبلیہ سے خطرہ ہے، کہیں وہ ہمارے درپے آزار نہ ہو جائیں، آپ کی موجودگی کے بغیر میں ہدم نہیں کر سکتا۔" اس پر عثمان چھ سو آدمیوں کے ساتھ چلا، قریب پہنچنے پر اہلِ جبلیہ نے بزور روکنے کا ارادہ کیا، لیکن جب انہوں نے عثمان کی طرف سے بھی پوری تیاری دیکھی، تو ہٹ گئے۔ اس پر عثمان نے شیخ سے کہا کہ "ہم قبہ کو چھو نہیں سکتے۔" اس پر شیخ نے ہتھوڑا (فاس) لیا اور اپنے ہاتھ سے قبہ کو گرا کر زمین کے برابر کر دیا اور کامیاب واپسی ہوئی۔ اس رات کو اطراف ونواح کے جاہل بے چینی کے ساتھ انتظار کر رہے تھے کہ دیکھیں اس ناروا اقدام سے شیخ پر کیا مصیبت آتی ہے لیکن جسے اللہ رکھے اسے کون چکھے، جب صبح ہوئی تو لوگ بہت مایوس ہوئے اور اہلِ حق کی ہمت بندھی - نیز کمزوروں کے ایمان میں تازگی آئی"[1]۔

یہ صرف ایک واقعہ کی تفصیل تھی - وہاں قدم قدم پر یہی دشواریاں تھیں - جاہلوں سے لے کر علماء اور مشائخ تک سب کے سب بدعات کی تاریکیوں میں گھرے ہوئے تھے - یہ ابنِ عبد الوہابؒ کی آواز اور کوشش تھی، جس نے صدیوں کی تاریکی اور گمراہی کے بعد حق

---

[1] عنوان المجد ص ۱۰ - ۹

کا بول بالا کیا اور صحیح اسلامی تعلیم سے خلقِ خدا روشناس ہوئی۔

شیخ نے امیر عثمان بن معمر کو نماز باجماعت کے احیا کی بھی تاکید کی اور متخلفین کے لیے سزائیں تجویز ہوئیں۔ حکام طرح طرح کے ٹیکس وصول کرتے تھے۔ شیخ نے تمام ٹیکس اڑا دیئے اور صرف زکوٰۃ کا اجراء کیا۔ شیخ نے قیامِ عیینیہ کے دوران میں ابن معمر کے ہاتھ سے یہ دو کام اچھے کرائے، لیکن ان کے دشمن اس میں بھی حرف نکالتے تھے۔

شیخ نے عیینیہ ہی میں اپنے تبلیغی رسالوں کا سلسلہ شروع کیا، جو مرتے وقت تک جاری رہا، درعیہ میں ان کے ماننے والے کچھ پیدا ہو گئے تھے، ان ہی کے نام آپ نے عیینیہ سے ہدایت نامے جاری کیے تھے۔[1]

عیینیہ سے اخراج

عیینیہ میں کامیابی قدم لینے کو تھی اور اصلاح کی مہم مکمل ہوتی جا رہی تھی کہ قدرت نے ایک شر پیدا کیا، جس میں ہزاروں برکتیں پنہاں تھیں۔

"ہونے والی بات، ایک عورت شادی شدہ گناہ کی مرتکب ہوئی اور اس نے شیخ کے سامنے گناہ کا اعتراف بھی کرلیا۔ بار بار جرح کرنے پر بھی وہ اپنے اقرار سے نہ پھری۔ مجبوراً شیخ نے سنگ ساری کا حکم دیا، عثمان بن معمر نے مسلمانوں کی ایک جماعت کے ساتھ یہ فرض انجام دیا، سب سے پہلا شخص جس کا ہاتھ پتھر کی طرف بڑھا وہ عثمان تھا۔"[2]

اس "غیر متوقع حادثہ" نے اطراف وجوانب میں تہلکہ پیدا کر دیا۔ خصوصیت کے ساتھ ان حلقوں میں جو برائیوں کے خوگر تھے اور زیادہ کھلبلی مچی۔ بات لگانے والے سلیمان بن محمد عزیز الحمیدی (حاکم احسا و قطیف) کے دربار میں پہنچے اور اسے شیخ کی مخالفت پر آمادہ کیا۔ یہ شخص نہایت

---

[1] روضۃ الافکار: ۱: ۲۰۰۔ [2] روضۃ الافکار: ۲: ۳، ۳ - ۲ عنوان المجد: ۱: ۱۰۰

رنگیلا اور آوارہ مزاج تھا۔ رجم کے واقعہ سے اس کا برہم ہونا بالکل متوقع تھا، کہنے والوں نے اس سے کہا کہ یہ شخص ابن عبدالوہابؒ تمہاری آزادیوں کی راہ میں رکاوٹ پیدا کرنا چاہتا ہے۔ بات لگتی ہوئی تھی اس کے دل میں جم گئی۔ اس نے فوراً عثمان بن معمر امیر عینیہ کو تہدید آمیز انداز میں لکھا:۔

"یہ مطوعؒ[1] جو تمہارے ہاں مقیم ہے، اس نے ایسے ایسے کام کیے ہیں اُسے قتل کرو، ورنہ تمہیں ہمارے ہاں سے جو کچھ ملتا ہے، وہ سب روک دیا جائے گا۔"

چونکہ وہ رقم کافی تھی، یعنی مال و متاع کے علاوہ بارہ سو دینار سالانہ اس وجہ سے وہ ایسا متردد ہوا، کہ دنیا کی طمع، توحید کی حمایت پر غالب آنے لگی، ابھی اس کا سینہ دعوتِ توحید کا محرم نہیں بنا تھا، نہ اسے یہ معلوم تھا، کہ حق کے ساتھ دینے والوں پر غیب سے کیا کیا انعامات ہوتے ہیں؟ اسی حیص بیص میں اس نے شیخ کو سلیمان حاکم احساء کے پیغام کی اطلاع دی۔ شیخ نے اسے تسلی دینا چاہی اور پورے یقین کے ساتھ اسے سمجھانے کی کوشش کی۔ ابن بشر کی زبانی شیخ کے یہ الفاظ سننے کے لائق ہیں:۔

اِنَّ ھذا الذی انا قمت بہ و دعوت	میں جو اس چیز کو لے کر کھڑا ہوا ہوں اور اس
الیہ کلمۃ لا اِلٰہ الا اللہ و ارکان	کی دعوت دی ہے وہ کلمہ لا اِلٰہَ اِلَّا اللہ ارکان
الاسلام و الامر بالمعروف والنھی	اسلام اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر (دعوت)
عن المنکر فان انت تمسکت بہ	ہے، اگر تم اس کو مضبوط پکڑ لو اور اس کی مدد
و نصرتہ فان اللہ سبحانہ یظھرک	کرو تو اللہ تعالیٰ تمہیں تمہارے دشمنوں پر

---

[1] اہلِ نجد کی زبان میں مولوی اور فقیہ کو مطوع کہتے ہیں، جمع مطاوعہ استعمال ہوتی ہے موحدین کی نئی منظم برادری اخوان، میں بھی مبلغوں کی جماعت "مطاوعہ" کہلاتی ہے۔

علیٰ اعدائک فلا یزعجک سلیمان ولا یفزعک[1] .... الخ
غالب کرے گا۔ سلیمان کی وجہ سے تمہیں پریشان ہونے اور گھبرانے کی ضرورت نہیں۔

شیخ نے ہر طرح کی کوشش کی، پر جب زوالِ دنیا کا خوف قلب پر طاری ہو جائے تو پھر کوئی فہمائش کام نہیں کرتی۔ شیخ کی مؤثر اور پُر امید نصیحت سے پہلی مرتبہ تو وہ رک گیا لیکن پھر سے نہ رہا گیا اور شیخ کے پاس دوبارہ کہلا بھیجا:۔

"سلیمان نے ہمیں آپ کے قتل کا حکم دیا ہے اور ہم میں اس کے حکم سے سرتابی کی جرأت نہیں نیز یہ ہماری مروت سے بعید ہے کہ آپ کو اپنے گھر میں تہ تیغ کریں۔ اس لیے آپ آزاد ہیں، ہمارا علاقہ چھوڑ دیں"[2]

یہ پیام دیا اور اپنے ایک سپاہی فرید الظفیری کی ہمراہی میں عینیہ کے حدود سے باہر کر دیا۔ اس "اخراج" کی داستان بھی عبرت انگیز اور پر ورد ہے۔ ریگستان عرب کی سخت دھوپ، شیخ آگے آگے پیادہ پا، ہاتھ میں صرف ایک پنکھا اور پیچھے پیچھے فرید گھوڑے پر سوار، ابن بشر نے تو یہاں تک لکھا ہے کہ ابن معمر نے در پردہ شیخ کے قتل کا بھی حکم دے دیا تھا۔ شیخ آگے آگے "مَنْ يَتَّقِ اللهَ يَجْعَلْ لَّهُ مَخْرَجًا وَّيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ" کا ذکر کرتے ہوئے چلے جاتے تھے، سپاہی نے راستہ میں بات نہیں کی۔ جب اس نے قتل کا ارادہ کیا تو خود اس کے بیان کے مطابق کسی غیبی طاقت نے اس کا ہاتھ روک لیا اور اس پر رُعب طاری ہو گیا اور اسی عالم میں وہ الٹے پاؤں عینیہ کی طرف واپس ہو گیا، صداقت کا کچھ ایسا رعب طاری ہوا کہ سچ مچ اسے اپنی جان خطرے میں نظر آنے لگی۔

درعیہ میں ۱۱۵۷-۸ھ

ابن معمر کے حدود سے نکل کر شیخ نے درعیہ کا رُخ کیا اور عصر کے وقت وہاں پہنچے۔ پہلے وہ عبداللہ بن عبدالرحمٰن

---

[1] عنوان المجد ص ۱۰۰ - [2] ایضاً ص ۱۱

بن سویلم العزینی کے گھر اترے اور پھر اپنے ایک شاگرد احمد بن سویلم کے ہاں منتقل ہو گئے۔ خبر پاتے ہی امیر درعیہ محمد بن سعود اپنے بھائیوں مشاری اور ثنیان کے ساتھ خدمت میں حاضر ہوا اور سب نے مل کر شیخ کو امداد اور فرماں برداری کا یقین دلایا[1]۔

یہ مختصر روداد ابن غنام سے منقول ہے۔ ابن بشر نے اس اہم واقعہ کو جسے شیخ کی تبلیغی زندگی میں خاص اہمیت حاصل ہے، ذرا تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے۔ ابن غنام کے بعد ہم ابن بشر کی روایت بھی ذیل میں درج کرتے ہیں:۔

> "شیخ درعیہ عصر کے وقت پہنچے، جہاں وہ ایک خوش بخت انسان محمد بن سویلم العریضی کے گھر اترے، بیچارہ عربی اخلاق سے مجبور رہو کر کچھ نہ بولا پر امیر کے خوف سے اس کے اوسان خطا ہو رہے تھے۔ شیخ نے نصیحت کی اور تسکین دی۔ سیجعل اللہ لنا ولک فرجًا ومخرجًا۔"

امیر محمد بن سعود کی معاونت

ابن سویلم کے گھر ٹھہرے، تو وہ دعوتِ توحید کا مرکز بن گیا۔ لوگ چھپ چھپ کر آنے لگے۔ اہلِ علم خاص طور پر مستفید ہوتے لیکن یہ صورت قابلِ اطمینان نہ تھی۔ شیخ نے امیر سے سلسلہ جنبانی کرنا چاہی اور امیر کے بھائیوں مشاری اور ثنیان سے گفتگو کی۔ انہوں نے پہلے امیر کی بیوی موضٰی بنت ابی وحطان سے جو نہایت ذی فہم اور متدین خاتون تھی، شیخ کے علم و فضل کی تعریف کی اور اسے امیر سے سلسلہ جنبانی پر آمادہ کیا۔ قدرت کو یونہی کرنا تھا۔ موضٰی کے دل پر خود بخود شیخ کے علم و فضل کا سکہ جم گیا۔ اس نے امیر سے عرض کی:۔

> "اللہ نے یہ نعمت تمہارے ہاں بھیج دی ہے، اٹھو اور اس کی مدد کرو تمہاری دنیا و آخرت دونوں سنور جائیں گی۔"

---

[1] روضۃ الافکار ۲، ۶

امیر محمد بن سعود، جو شیخ کی دعوت سے پہلے بھی حسن اخلاق میں مشہور تھا، اپنی بیوی کی گفتگو سے متاثر ہوا اور اس کے دل میں شیخ کی محبت گھر کر گئی۔ سب کے اصرار سے اس نے ملنے میں پہل کی اور اخلاق و عقیدت سے پذیرائی کی۔ شیخ نے جواب میں اپنی دعوت کے اہم حصوں (کلمہ لا الہ الا اللہ کا مفہوم، امر بالمعروف، نہی عن المنکر، جہاد) پر مختصر سی تقریر کی اور ان کی اصلاح کی طرف توجہ دلائی۔ امیر متاثر ہوا اور بے ساختہ بول اٹھا:۔

"اے شیخ! یہ تو بلاشبہ اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا دین ہے۔ میں آپ کی امداد اطاعت اور مخالفینِ توحید سے جہاد کرنے کے لیے تیار ہوں لیکن میری دو شرطیں ہیں:۔

۱۔ اگر ہم نے آپ کی مدد کی اور اللہ نے ہمیں فتح دی تو آپ ہمارا ساتھ نہ چھوڑیں۔

۲۔ اہل درعیہ سے فصل کے وقت میں کچھ مقررہ محصول لیتا ہوں آپ مجھے اس سے نہ روکیں۔"

شیخ نے جواب دیا:۔

"پہلی شرط بسر و چشم منظور ہے، ہاتھ لاؤ: الدم بالدم والهدم بالهدم (میرا خون تمہارا خون اور میری تباہی تمہاری تباہی)۔ رہی دوسری شرط سو انشاء اللہ تمہیں فتوحات اور غنیمتوں میں اتنا کچھ مل جائے گا کہ اس خراج کا خیال بھی دل میں نہ آئے گا۔"

امیر نے شیخ کے ہاتھ پر بیعت کی۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا عہد کیا کتاب و سنت کے بتائے ہوئے طریقوں پر چلنے کی آمادگی ظاہر کی۔ یہ ۱۱۵۷ھ[1] یا ۱۱۵۸ء کا ذکر

---

[1] ابن غنام ان سب واقعات کا ذکر کرتا ہے اور ۱۱۵۷ھ کے حدود میں۔ کانت ھذہ الامور فی حدود سنة سبع وخمسین بعد المائة والالف من الهجرة (۲: ۴)۔ ابن بشر نے انتقال درعیہ کی تاریخ ۱۱۵۸ھ لکھی ہے (ص ۱۵)، اور تفصیلات عنوان المجد، ہی سے ماخوذ ہیں (۱: ۱۲-۱۱)

ہے۔ امیر کا بیعت کرنا تھا کہ جوق در جوق لوگ استفادہ اور تجدید ایمان و اعمال کے لیے آنے لگے۔ عینیہ کے پرانے فیض یافتہ اور ہم نشین، جن کے دلوں میں شیخ کی دعوت گھر کر چکی تھی۔ درعیہ آگئے۔ ان آنے والوں میں خود عثمان بن معمر رئیس عینیہ کے بعض عزیز بھی تھے۔

ارادت مندوں کا پہلا گروہ

یوں تو عینیہ ہی کے دور قیام میں شیخ کی طرف لوگ کھینچنے لگے تھے، لیکن ایک عرصہ تک بدعات اور تاریکی میں گھرے رہنے کے بعد عام طور پر خلقت قبول حق میں ہچکچاہٹ محسوس کرتی تھی۔ درعیہ کے قیام اور امیر محمد بن سعود کی نیک نامی نے دعوت کی کامیابی کے لیے اچھی زمین تیار کر دی جن خوش قسمت لوگوں نے آغاز کار ہی میں جوش و خروش کے ساتھ دعوت پر لبیک کہا اور اس سلسلہ میں خود بھی ابتلاء و محن سے دوچار ہوئے ان میں بعض نام ابن غنام کی عنایت سے ہم تک پہنچ گئے ہیں۔

خاندانی اور باوجاہت لوگوں میں محمد بن سعود کے تین بھائیوں مشاری[1] ثنیان اور فرحان کے نام پہلے آتے ہیں، اہل علم میں احمد بن سویلم اور عیسیٰ بن قاسم زیادہ ممتاز تھے اور عام رسوخ و اثر کے اعتبار سے محمد الحزیمی، عبداللہ بن دغیثر، سلیمان ابوشیقری، احمد بن حسین کے

---

[1] یوں تو اس دعوت، اور پھر آگے چل کر جہاد و قتال کے سلسلہ میں امیر محمد بن سعود اور ان کے پورے گھرانے نے نمایاں کام کیے لیکن ہمیں یہاں بحث صرف شیخ کی دعوت سے ہے اور اس سلسلہ میں ثنیان ابن سعود (ف ۱۱۸۶ھ) اور مشاری بن سعود (ف ۱۱۸۹ھ) زیادہ ممتاز ہیں۔ مشاری نے بھائی کی بڑی امداد کی اور ان کے بیٹے حسن بن مشاری نے لڑائیوں میں شمشیر آبدار کے خوب جوہر دکھائے ثنیان بن سعود زاہد اور عفیف النفس تھے، گو وہ بینائی سے محروم تھے لیکن ان کی بصیرت بڑھی ہوئی تھی، اصل میں محمد بن سعود ان ہی کے مشورہ سے شیخ کی امداد پر کمربستہ ہوئے۔

(روضۃ الافکار ۲: ۹۴-۱۰۵، عنوان المجد: ۲-۱۰، ۹)

نام آج تک زبان زد ہیں۔ فلبی (ص ۱۳-۱۲) کے بیان کے مطابق :۔

"یہ وہابیت کے پہلے بہادر کارکن تھے، ان کے نام آج تک عزت سے لیے جاتے ہیں اور ان کی اولاد سلطان کے دربار میں اعزاز کی مستحق سمجھی جاتی ہے۔"

ابنِ معمر کی زودِ پشیمانی

دعوت کی روز افزوں عمومیت اور مقبولیت کی خبر پاکر ابن معمر سے نہ رہا گیا۔ اسے اپنے پہلے طرزِ عمل پر بڑی پشیمانی ہوئی اور شیخ کی خدمت میں حاضر ہو کر معذرت کی۔ ساتھ ساتھ عینیہ واپس چلنے کی درخواست بھی کی۔ شیخ نے جواب میں صاف کہا :۔

"اب یہ امیر ابن سعود کے اختیار میں ہے، ان کی اجازت ہو تو میں تیار ہوں، ورنہ انہیں چھوڑ کر اب کسی دوسرے کی رفاقت منظور نہیں۔"

یہ واضح جواب پاکر ابن معمر نے خود میزبان محمد بن سعود سے اجازت طلب کی۔ لیکن وہ اس نعمت کو اپنے گھر سے کسی دام پر الگ کرنے کو تیار نہ تھے۔

دورِ عمل

شیخ کی تشریف آوری سے پہلے درعیہ ایک چھوٹا سا قصبہ تھا، جہاں جہاں جہالت کی گرم بازاری تھی۔ شیخ نے سب سے پہلے وعظ و درس کے حلقے قائم کیے اور خود صبح سے شام تک آنے والوں کو کتاب و سنّت کی تعلیم دیتے اور اپنی دعوت، دعوت توحید و اخلاص فی عبادۃ اللہ کی اہم اور ضروری چیزیں ذہن نشین کرانے کی کوشش کرتے، شیخ کی جاذب شخصیت اور دعوت کی سچائی نے فوری اثر دکھایا، مجالس وعظ و تذکیر سے یہ فائدہ پہنچا کہ دلوں سے "ما الفینا علیہ اٰباءنا" کا زنگ دور ہونے لگا اور رسم و رواج کے خرافات کو وہ صرف قرآن و حدیث کی روشنی میں دیکھنے لگے۔

ان مجالس کی کشش دور دور سے تشنگانِ علم کو درعیہ لے آئی جہاں رزق کی تنگی کے باعث یہ علم و عمل کے پیاسے راتوں کو کسی حرفت کے ذریعہ قوت لایموت حاصل کرنے کی کوشش

کرتے اور دن کا وقت اللہ کی کتاب اور اس کے برگزیدہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی بتائی ہوئی باتوں کو سننے کے لئے وقف رہتا۔ شاگردوں اور ارادت مندوں کی زبانی اور ان کی میزبانی کے باعث شیخ برابر مقروض رہتے۔ بہر حال دعوت کی مقبولیت دن بدن بڑھتی گئی اور آنے والوں کا تانتا بندھا رہتا۔[1]

دعوت کی وسعت

اہل درعیہ تو شیخ کے قدم رکھتے ہی عقیدت مندوں میں شامل ہو گئے لیکن وہ اس پر قانع نہ تھے، نجد کے مختلف حصّوں اور ان کے سرداروں کو ترغیب دیتے اور اپنی دعوت سے آگاہ کرتے۔ گو مخالفتیں بھی ہوئیں اور افترا پردازیوں میں بھی کوئی کمی نہیں کی گئی۔ پھر بھی حق کی آواز بلند ہوتی گئی اور آہستہ آہستہ اس کے ثمرات بھی ظاہر ہونے لگے، قیام درعیہ کے دوسرے ہی سال (۱۱۵۸ھ) یا (۱۱۵۹ھ) امیر عیینہ نے آکر بیعت کی اور حدود شرعیہ کے نفاذ کا عہد کیا۔ تھوڑے ہی دنوں کے بعد اہلِ حریملا نے بھی بیعت کی ادھر امیر محمد بن سعود کی معاونت کا یہ عالم تھا کہ خمس اور زکوٰۃ کی تمام رقمیں شیخ کے ہاتھ میں دی جاتیں اور انہیں بے دریغ اللہ کی راہ میں خرچ کرتے۔ امیر ابن سعود اور ان کے جانشین عبد العزیز بن محمد سعود جو (۱۱۷۹ھ / ۱۷۶۵ء) میں اپنے والد کی وفات کے بعد منصبِ امارت پر متمکن ہوئے، شیخ کی اجازت کے بغیر ادنیٰ تصرف روا نہیں رکھتے اور جو کچھ آتا سب اللہ کی راہ میں صرف کر دیتے۔

ابن بشر کا بیان ہے (ص ۱۵) کہ خمس اور زکوٰۃ سے جو کچھ آتا وہ فوراً تقسیم کر دیتے ان کی اس فراخ دستی کا نتیجہ یہ تھا کہ وہ برابر مقروض رہتے، صرف فتح ریاض[2] (۱۱۸۷ھ / ۱۷۷۳ء) کے وقت ان پر چالیس ہزار قرض تھا، جو مالِ غنیمت سے ادا کیا گیا۔"

---

[1] عنوان المجد (ص ۱۵-۱۳)

[2] عنوان المجد: ص ۱۵) ریاض پر مکمّل قبضہ ربیع الآخر ۱۱۸۷ھ کے اواخر میں یا اس کے بعد ہوا۔ (جولائی ۱۷۷۳ھ)

یہ سارا قرض اور تمام دریا دلی تبلیغ کے سلسلہ میں ہوتی تھی، جو فتح ریاض تک برابر جاری رہی۔ فتح ریاض کے بعد شیخ کو اپنی دعوت کی کامیابی کے متعلق ایک گونہ اطمینان ہو گیا تو انہوں نے امیر عبد العزیز کو سیاہ و سپید کا مالک بنا کر اپنے آپ کو بیت المال کے انتظامات سے بالکل الگ کر لیا اور اپنی تمام توجہ تعلیم و تدریس پر مرکوز کر دی، لیکن عبد العزیز شیخ کے مشورہ کے بغیر کوئی کام نہ کرتے، ہر کام میں ان کی رائے مقدم تھی۔

تبلیغ عام

اب تک شیخ کی دعوت نجد کے اضلاع تک محدود رہی، لیکن یہ دعوت عام تھی، اصلاح کی ضرورت صرف نجد میں نہ تھی، تمام اسلامی دنیا انحطاط کے عالم میں تھی۔ اصلاح کی ابتداء گھر سے ہوتی ہے، اس لیے قدرتی طور پر عینیہ، حریملا، درعیہ اور عارض کے دوسرے قصبے شیخ کی دعوت کے اولین مرکز بنے، لیکن جونہی ان علاقوں میں زندگی کی علامتیں ظاہر ہوئیں، شیخ نے اپنی دعوت کا حلقہ وسیع کیا اور دُور دُور کے شہروں کے علماء، امراء اور قضاۃ کے پاس تبلیغی خطوط بھیجے اور انہیں اپنی دعوت کے قبول کرنے پر آمادہ کرنے لگے، پر کم تھے وہ جنہوں نے شروع شروع دعوت قبول کی، زیادہ وہ تھے جنہوں نے شیخ کی دعوت کا مذاق اُڑایا، کسی نے انہیں جاہل کہا، کسی نے جادوگر اور کسی نے ایسی تہمتیں لگائیں جن سے وہ پاک تھے۔

دعوت پر لبیک کہنے والوں اور اس کی حمایت کرنے والوں میں سب سے زیادہ ممتاز صنعاء (یمن) کے مجتہد النظر عالم امیر محمد بن اسماعیل[1] (ف ۱۱۸۲ھ) تھے جنہوں نے شیخ

---

[1] امیر محمد بن اسمٰعیل یمنی صنعانی اپنے وقت کے امام اور مجتہد مطلق کا رتبہ رکھتے تھے۔ ولادت شب جمعہ ۱۵ رجادی الآخرہ ۱۱۹۹ھ / ۱۶۸۷ء کحلان میں ہوئی، وفات کی تاریخ سہ شنبہ ۳ رشعبان ۱۱۸۲ھ / ۱۷۶۹ء ہے۔ ان کے مختصر توحیدی رسالہ "تطہیر الاعتقاد عن اوران الالحاد" کا حوالہ آچکا ہے، آگے بھی ذکر آئے گا، تصنیفات کے لیے ملاحظہ ہو بروکلمن (ذیل : ۲، ۵۵۶) دیگر حالات کے لیے البدر الطالع (۲: ۹-۱۳۳) اور عنوان المجد (۱: ۶-۵۳)

کی دعوت پاکر اپنا وجد آفریں قصیدہ لکھا، جو اہل علم میں بہت مقبول ہوا، اس کا مطلع یہ ہے:۔

سلامی علی نجد ومن حلّ بالنجد　　وان کان تسلیمی علی البعد لایجدی

اس قصیدہ میں شیخ کی مدح، بدعات کی برائی اور وحدۃ الوجود کے عقیدہ کی پُر زور تردید اور بہت سی مفید باتیں ہیں۔

امیر محمد بن اسمٰعیل کو شیخ کی دعوت سے زیادہ خوشی اس لیے ہوئی کہ وہ اس سے پہلے اپنے کو اس باب میں منفرد خیال کرتے تھے، جیسا کہ اس شعر سے ظاہر ہوتا ہے ؎

لقد سرّنی ما جاءنی من طریقه　　وکنت اری هذی الطریقة لی وحدی

شیخ کو امیر یمنی کے قصیدے اور تائید سے بڑی تقویت ہوئی بعض رسالوں میں انہوں نے اس کی طرف اشارہ کیا ہے[1]۔

شیخ کے بھائی سلیمان بن عبدالوہاب (ف ۱۲۰۸ھ) جو اپنے باپ کی جگہ حریملا کے قاضی تھے، اول اول ان کے مخالف ہوئے اور ان کی تردید میں رسالے بھی لکھے جو غلط بیانیوں سے پر تھے، ابن غنام کی زبان میں انہوں نے "حسداً وغیرۃً" مخالفت کی تھی، شیخ نے ان کی تردید میں رسالے بھی لکھے، لیکن آخر میں انہیں توفیق ہوئی اور اپنے بھائی کے پاس تائب ہو کر آئے۔

"رجع الی اخیه بالدرعیة تائباً سنة ۱۱۹۰، فاحسن الیه الشیخ واکرم مثواه[2]"

(۱۱۹۰ھ میں تائب ہو کر اپنے بھائی کے پاس درعیہ آئے تو شیخ حسنِ سلوک سے پیش آئے اور ان کی آو بھگت کی)

---

[1] ابن غنام (۲: ع، ۱: ۸-۵۶)

[2] ابن غنام (۲: ۱۰۸)

سلیمان بن عبدالوہاب کا رسالہ "الصّواعق الالٰھیة فی الرّد علی الوھابیة" کے نام سے چھپا ہوا ملتا ہے۔ مخالف اس رسالہ کا ذکر کرتے ہیں، لیکن سلیمان کی توبہ اور "رجوع" کا نام بھی زبان پر نہیں لاتے۔

سلیمان بن عبدالوہاب کی مخالفت ۱۱۶۷ھ میں بہت تیز ہوگئی تھی، اسی سال شیخ نے اطراف واکناف سے مسلمانوں کو جمع کیا اور ان کے سامنے اپنی دعوت پر واضح اور کھلی ہوئی تقریر کی۔

دعوت کی بنیاد اور اس کی موافقت ومخالفت کا ذکر آگے تفصیل سے آئے گا۔ یہاں صرف دعوت کی عمومیت دکھانا تھی تشنگانِ علم تو درعیہ جوق درجوق آتے ہی تھے، شیخ کے تبلیغی رسالے، مبلغین اور ہدایت نامے بھی اطراف واکناف میں پھیل رہے تھے۔

ابن دواس اور دوسرے مخالفین

درعیہ کی اقامت کے تیسرے ہی سال (۱۱۵۹ھ) دہام بن دواس حاکم ریاض کی زیادتیوں نے شیخ اور امیر محمد بن سعود کو اپنی طرف متوجہ کیا۔ ریاض اور منفوحہ کے موحدین کو صرف اتباع شیخ کے جرم میں اس نے گوناگوں زیادتیوں کا شکار بنایا۔ مجبوراً شیخ نے بھی اپنے پیروؤں کو مقابلہ اور مقاتلہ کا حکم دیا۔ پھر کیا تھا امیر محمد بن سعود، ان کے بھائیوں اور بیٹوں نے معاندین کی خوب خبر لی اور جنگ وقتال کا سلسلہ ایک عرصہ تک جاری رہا۔

صرف دہام بن دواس حاکم ریاض سے پچیس تیس سال چھیڑ چھاڑ کا سلسلہ قائم رہا۔ ۱۱۵۹ھ سے ۱۱۸۷ھ تک دونوں قوتیں برسرِ پیکار رہیں۔ آخر ۱۱۸۷ھ میں عبدالعزیز محمد بن سعود کے "تازہ حملہ" کی خبر پاکر ابن دواس شہر چھوڑ کر بھاگ کھڑا ہوا اور قلب نجد (ریاض) پر امیر عبدالعزیز کا مکمل قبضہ ہوگیا۔[1]

---

[1] ARABIA از فلبی (ص ۲۵-۱۳)

اسی دوران میں آس پاس کی دوسری طاقتیں بھی حملہ آور ہوئیں۔ عثمان بن معمر حاکم عینیہ نے بار بار دھوکہ دیا۔ اہلِ نجد اور شیخ کی بڑھتی ہوئی طاقت دیکھ کر مخالفوں نے اوچھے ہتھیار استعمال کرنا شروع کیے۔ سلیمان بن محمد سحیم نے شیخ پر بہتان باندھے اور ان کی طرف قسم قسم کی برائیاں منسوب کیں۔ خلیج فارس، احسا اور دوسرے ملکوں کو اس نے رسالے لکھ کر بھیجے۔ شیخ نے ان میں سے ایک رسالہ کا مفصل جواب دیا ہے۔ افتراء پردازیوں اور جواب کی نوعیت پر آگے گفتگو ہوگی۔ ایک طرف ایک نام نہاد علم و عمل کے اجارہ دار تھے، دوسری جانب چھوٹے چھوٹے علاقوں کے سردار اپنی اپنی خود مختاری کے بچاؤ کی خاطر ان افترا پردازیوں کا ہاتھ بٹانے لگے۔[1]

پر ان تمام رکاوٹوں کے باوجود دعوت کا حلقہ وسیع ہوتا گیا اور مطوع درعیہ سے نکل کر تمام علاقوں میں پھیل گئے، تا آنکہ کم از کم قلب جزیرہ میں محمد بن عبداللہ (المفدیؐ بابی و امی صلی اللہ علیہ وسلم) کی تعلیمات، اپنی اصلی صورت میں جلوہ گر ہوگئیں۔

وفات

شیخ نے پچاس سال مسلسل دعوت و تبلیغ کے بعد شوال یا ذی قعدہ ۱۲۰۶ھ (جون یا جولائی ۱۷۹۲ء) میں رحلت کی۔[2]

دنیا و مافیہا سے بے نیاز عجیب ہستی تھی۔ کم لوگوں کو اپنی زندگی میں ایسی قبولیت حاصل ہوئی ہوگی۔

شیخ کے شاگرد ابن غنام[3] نے ایک پُر درد مرثیہ لکھا تھا، جس کا مطلع یہ ہے ؎

الی اللہ فی کشف الشدائد نفزع — ولیس الی غیر المہیمن مفزع

---

[1] ابن غنام: ۱: ۲۷-۲۸، ۱۶۷-۱۴۲)

[2] ابن غنام (۲: ۷۴) ابن بشر (۱) ۹۵ باقی اکثر مغربی اور مشرقی مؤرخوں نے تاریخ وفات میں غلطی کی ہے۔ مثال کے لئے ملاحظہ ہو: بروکلمن (ذیل: ۲، ۵۲، مارگولیوتھ (انس۔ اسلام: ۴، ۱۰۸۶)، لبیب بتنونی (الرحلۃ الحجازیۃ: ۸۷) [3] روضۃ الافکار (ص ۱۷۵)

محمد حامد فقی[1] نے قاضی محمد بن علی شوکانی رح (ف ۱۲۵۰ھ) کا بھی ایک مرثیہ نقل کیا ہے، جس کا مطلع یہ ہے ؎

مصاب دھا قلبی فاذکی غلائلی ....

ایک بڑی خاصیت تاریخ اسلام میں بارہا ایسا ہوا ہے کہ غیر معمولی شخصیتیں مہدویت یا مسیحیت کے لباس میں جلوہ گر ہوئیں، جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ وہ مفید ہونے کے بدلے دین اور اس کی وحدت کے لیے انتہائی مضر ثابت ہوئیں۔ ہم اسے شیخ الاسلام کی دعوت کی انتہائی کامیابی خیال کرتے ہیں کہ ان کی تعلیمات اور ان کے پیرو ان اوہام سے بالکل الگ تھلگ اور خطرات سے بال بال بچے رہے، بعض اہل علم[2] نے افترا پردازیاں کیں، پر ان کے ماننے والے اور جانشین اپنے عقیدوں میں اتنے صاف اور واضح تھے کہ ان کی ایک نہ چلی اور نجد کے موحد پر کوششوں کے باوجود ان کی تصنیفات اور رسالوں سے کوئی ایسا الزام نہ تراشا جا سکا۔ ان کی کتابیں کھلی ہوئی اور دو چار کے انداز میں اپنے لکھنے والے کی جرأت اور صداقت کی شہادت دیتی ہیں، پوری کتاب "التوحید" پڑھ جاؤ کوئی پیچیدگی، تصوف، توہم، دوازکار باتیں، منطقیانہ استدلال، یونانی کج بحثی، ان میں کسی چیز کا ادنیٰ شائبہ بھی نہ ملے گا۔

دوسری خصوصیت محمد بن عبد الوہاب رح ایک ٹھیٹھ عالم تھے، ان کی نگاہیں بڑی دور رس تھیں۔ انہوں نے اپنی زندگی میں ثمرات دیکھے، دینی ثمرات بھی اور دنیوی پھل پھول بھی، ان کی زندگی میں نجد کا پورا علاقہ مفتوح ہو چکا تھا، امیر نجد اور ان کے اہل خاندان قدموں پر جان نچھاور کرنے کو تیار رہتے تھے، سارا جاہ و حشم

---

[1] اثر الدعوة الوہابیة فی جزیرة العرب ص ۸۰ - ۷۸)

[2] احمد زینی وحلان (ف ۱۳۰۴ھ) کی الدرر السنیہ (ص ۴۲) ملاحظہ ہو۔

یہ شیخ کی جوتیوں کا صدقہ تھا۔ مجاہد اور عام قوم انہی کو جانتی تھی اور انہی پر فریفتہ تھی، وہ چاہتے تو سلطنت میں اپنی اولاد کا حصّہ رکھتے، خود زمامِ حکومت اپنے ہاتھ میں لیتے۔ لیکن انہوں نے اپنے کو ان ذمہ داریوں سے یکسر الگ رکھا۔ امیر محمد بن سعود اور ان کے جانشین امیر عبدالعزیز ان کے مشوروں کے بغیر کوئی کام نہیں کرتے اور نہ کرنا چاہتے۔ سارا مالِ غنیمت ان کے قدموں پر لاکر ڈال دیا جاتا، لیکن اس اللہ کے بندے نے اپنے کام سے کام رکھا۔ جب تک ضرورت رہی دخل دیتے رہے، جونہی انہوں نے محسوس کیا کہ اب دعوت کی بنیادیں استوار ہو گئی ہیں اپنے کو ملکی انتظامات اور مالِ غنیمت کے نظم و نسق سے یکسر الگ کر لیا۔ شیخ کی اس بے نفسی کا بڑا فائدہ یہ ہوا کہ ان کی اولاد بھی دنیاوی جاہ و حشم سے الگ دین کی خدمت میں مصروف رہی اور آج تک جب کہ شیخ کی وفات کو ڈیڑھ سو برس ہو گئے کبھی ان کی اولاد تخت و تاج کے لیے آلِ سعود سے دست بہ گریباں نہیں ہوئی۔

اولاد و احفاد

شیخ کے شاگردوں اور ان کے حلقۂ درس و ارشاد سے مستفید ہونے والوں کا شمار و استقصاء تو تقریباً ناممکن ہے جس درس میں پچاس ساٹھ سال مسلسل خوشہ چینوں کا تانتا بندھا رہا ہو، اس کی وسعت گیری کا کیا ٹھکانا؛ اگر شاگردوں کا ذکر کیا بھی جائے تو تذکرے اور تراجم کی کمیابی الگ دامن پکڑتی ہے، اس لیے ہم شیخ کے شاگردوں میں صرف ان کی اولاد و احفاد کا تذکرہ کریں گے، جو بجا طور پر اب آل الشیخ کے نام سے پکارے جاتے ہیں اور یہی ان کا نسب ہے۔ یہ شیخ کی خوش نصیبی تھی کہ انہوں نے اپنے ایسے جانشین چھوڑے جو بالکل انہی کے طریقہ کے مطابق سنتِ رسول کے متبع اور تبلیغ و تدریس میں مشغول رہے اور اس سے زیادہ مسرت و اعجاب کی بات یہ ہے کہ یہ سلسلہ آج تک منقطع نہیں ہوا، آج تک ان کی اولاد علم و عمل میں پورے نجد میں ممتاز ہے۔

شیخ کثیر العیال تھے، بعض لڑکے ان کی زندگی میں وفات پا گئے۔ وفات کے وقت انہوں نے چار بیٹے چھوڑے حسین[1]، عبداللہ[2]، علی[3]، ابراہیم[4]۔

ابن بشر کہتا ہے کہ میں نے اپنی آنکھوں سے ان کے درس میں طلبا کا اتنا ہجوم دیکھا کہ کسی سے بیان کیا جائے تو شاید اسے یقین نہ آئے۔

"ان میں سے ہر ایک کے گھر کے پاس ایک مدرسہ تھا، جس میں پردیسی طالب علم رہا کرتے اور ان کے مصارف بیت المال سے ادا ہوتے، یہ لوگ شب و روز تحصیلِ علم میں مصروف رہتے۔"[1]

ان میں حسین بڑے تھے اور شیخ کے بعد اصلی جانشین وہی سمجھے جاتے۔ درعیہ کے قضاء پر مامور تھے۔ درعیہ کی جامع مسجد کی امامت بھی ان کے سپرد تھی۔ ۱۲۲۴ھ میں وفات پائی۔[2] ان کے متعدد بیٹے تھے اور سب کے سب علم و عمل میں ممتاز۔ ابن بشر نے علی، حمد، حسن عبدالرحمٰن، عبدالملک کے نام گنائے ہیں، ان میں علی بڑے اور علم میں بھی ممتاز تھے۔ اس لیے اپنے اعمام کی موجودگی میں منصب قضاء پر مامور ہوئے۔ سعود بن عبدالعزیز (۱۲۱۸ھ / ۱۸۰۳ء - ۱۲۲۹ھ / ۱۸۱۴ء) عبداللہ بن سعود (مصلوب ۱۲۳۴ھ / ۱۸۱۸ء) ترکی (مقتول ۱۲۴۹ھ / ۱۸۳۴ء) اور فیصل بن ترکی (ف ۱۲۸۲ھ / ۱۸۶۵ء) کے امیروں کے عہد میں عہدۂ قضاء پر مامور رہے۔ حمد زمانہ طالب علمی ہی میں وفات پا گئے۔ حسن، ترکی بن عبداللہ کے زمانہ میں ریاض کے قاضی تھے، فقہ میں اچھی دستگاہ تھی۔ عمر کم پائی اور ۱۲۴۵ھ میں دار آخرت کو چل بسے۔ عبدالرحمٰن، ترکی اور فیصل دونوں کے دورِ حکومت میں منصب قضاء پر فائز ہوئے۔ فقہ، تفسیر اور نحو کے اچھے عالم تھے۔ عبدالملک بن حسین بھی فیصل کے عہد میں حوطہ کے قاضی تھے۔ عبدالرحمن بن حسین علی عبدالرحمٰن بن حسین، حسن بن حسین، عبدالملک بن حسین، سب کے سب شیخ عبدالرحمن بن حسن بن محمد بن عبدالوہاب سے مستفید ہوئے۔ (جن کا ذکر آگے آتا ہے) اسی طرح حسین

---

[1] عنوان المجد (۱، ۹۳)

[2] عنوان المجد (۱، ۱۴۳)

بن شیخ الاسلام کی اولاد میں حسین بن حمد بن حسین بن شیخ الاسلام (قاضی حریق بہ عہد فیصل) حسین بن علی شیخ الاسلام (قاضی ریاض بہ عہد فیصل) اور عبداللہ بن حسین بن شیخ الاسلام بھی شیخ عبدالرحمٰن بن حسن شیخ الاسلام سے مستفید ہوئے۔

شیخ کے دوسرے بیٹے عبداللہ بن محمد بن عبدالوہاب بھی بڑے عالم تھے۔ ان کا شمار علمائے مصنفین میں تھا۔ حسین بن محمد کی وفات کے بعد یہی شیخ الاسلام کے جانشین مانے جاتے تھے۔ خود حسین بن محمد کی زندگی میں ان کی علمی حیثیت مسلم ہو چکی تھی۔ ۱۲۱۸ھ / ۱۸۰۳ء میں امیر سعود بن عبدالعزیز کے داخلہ مکہ مکرمہ کے وقت یہ ساتھ تھے اور امیر سعود نے اپنی جماعت کے عقائد سے متعلق جو رسالہ تقسیم کرایا تھا، وہ انہی عبداللہ بن محمد بن عبدالوہاب کے قلم کا لکھا ہوا تھا۔ ۱۲۳۳ھ میں ابراہیم پاشا کے حملہ درعیہ کے وقت موجود تھے لیکن مصری فوجوں کی وحشت اور غارت گری آپ سے دیکھی نہ گئی اور تلوار لے کر میدان میں کود پڑے۔

"نشهر سيفه عبد الله بن الشيخ محمد بن عبد الوهاب
وانتدب واجتمعوا عليه الخ"

اور خوب داد شجاعت دی، غالباً[1] گرفتار کر کے مصر بھیج دیئے گئے اور وہیں[2] وفات پائی۔ ان کے دو بیٹے سلیمان بن عبداللہ اور علی بن عبداللہ سقوط درعیہ کے وقت قتل کیے گئے

---

[1] عنوان المجد (۱، ۲۰۶)۔ [2] ابن بشر شیخ عبداللہ بن محمد کی بہادری اور قتال کا ذکر کرتا ہے، لیکن شہادت کے بارے میں خاموش ہے۔ وحلان (ص ۲۲۹) سلیمان بن عبداللہ محمد بن عبدالوہاب کے قتل کا ذکر کرتا ہے لیکن عبداللہ کے بارے میں خاموش ہے۔

ابن بشر کا ایک دوسرا بیان عبداللہ بن شیخ الاسلام کے قتل کی تردید کرتا ہے، وہ لکھتا ہے

"عبداللہ مذکور کے ایک بیٹے عبدالرحمٰن تھے جو انہی کے ساتھ کمسنی ہی میں مصر جلا وطن کر دیئے گئے تھے، مجھے معلوم ہوا ہے کہ اس وقت ازہر کے اواق حنابلہ میں مقیم ہیں اور ان کے پاس طلبا آتے جاتے ہیں اور ان میں علمی ذوق ہے۔ جلد ۱ ص ۹۳

سلیمان ممتاز عالم تھے۔ اپنے والد کی موجودگی میں درعیہ کے قاضی رہے۔ نیز امیر سعود کے دورِ امارت میں کچھ دنوں مکہ مکرمہ میں بھی انہوں نے قضاء کے فرائض انجام دیئے۔ امیر سعود بن عبدالعزیز کی مجلس میں صحیح بخاری کا درس ان کے سپرد تھا، جو بہت بڑا علمی امتیاز تھا، خود عبداللہ بن شیخ الاسلام امیر سعود کی مجلس میں "تفسیر طبری" اور "ابن کثیر" کا درس دیتے تھے! ابن بشر خود ان مجلسوں میں شریک رہا ہے، اس کے بیان سے ان علمی مجلسوں کی قدر و قیمت کا اندازہ ہوتا ہے[1]۔ اس نے ان کے طریقۂ تعلیم و تحدیث کا اچھے الفاظ میں ذکر کیا ہے، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر میں بہت ممتاز تھے، اسی لیے وحلان[2] نے انہیں ان کے والد سے "زیادہ متعصب" بتایا ہے، "کتاب التوحید" کی ایک شرح بھی لکھی تھی جو ابن بشر کے بیان کے مطابق نامکمل رہی[3]۔ اپنے والد شیخ احمد بن ناصر بن معمر (ف ۱۲۲۵ھ) اور شیخ حسین بن غنام (ف ۱۲۲۵ھ) سے تحصیل کی تھی۔ ۱۲۳۳ھ کے اواخر میں قتل کیے گئے۔ ان کے قتل کا واقعہ بھی عجیب دردناک ہے۔ آگے تفصیل آئے گی۔ اس کے علاوہ ان کی دوسری تالیف (کتاب التوضیح عن توحید الخلاق فی جواب اہل العراق) مطبوعہ ۱۳۱۹ھ ہمارے پیشِ نظر ہے جو ان کی وسعتِ علم کی شاہد ہے۔ بروکلمن (ذیل: ۲، ۵۳۲) نے ان کی دو کتابیں ذکر اور فکر کی ہیں۔ (۱) اوثق عری الایمان (ب) مسائل، جو راقم کی نظر سے نہیں گزریں۔ مجموعۃ التوحید المکیہ (مطبوعہ ۱۲۴۳ھ) میں بھی شیخ سلیمان بن عبداللہ کا ایک رسالہ بعض اہم مسائل کے جواب میں شامل ہے، ممکن ہے بروکلمن کا درج کردہ رسالہ "مسائل" اور یہ دونوں ایک ہی ہوں۔ علی بن عبداللہ بن الشیخ ۱۲۳۴ھ میں درعیہ کے قریب شہید ہوئے

---

[1] عنوان المجد: ۱، ۲۰۹، ۱۷۶، ۱۷۰، ۲۱۰۔ [2] خلاصۃ الکلام ص ۲۲۹۔

[3] شیخ عبدالرحمٰن بن حسن بن شیخ الاسلام نے یہ شرح مکمل کی، جیسا کہ انہوں نے فتح المجید کے دیباچہ میں تصریح کی ہے۔

حدیث وتفسیر میں اچھی دستگاہ تھی۔ انہوں نے بھی کتاب التوحید کی ایک شرح لکھی تھی[1]۔ عبداللہ بن شیخ الاسلام کے تیسرے بیٹے عبدالرحمٰن بن عبداللہ بھی مشہور عالم ہوئے۔ حسین بن شیخ الاسلام کے متعدد مختصر رسالے اور فتوے مشرقی کتاب خانہ پٹنہ کے ایک مجموعے میں درج ہیں[2]۔

علی بن شیخ الاسلام بھی ممتاز عالم اور زہد و ورع میں ضرب المثل تھے۔ فقہ وتفسیر میں اچھی دستگاہ تھی۔ قضاء کا منصب پیش کیا گیا، لیکن انہوں نے غایت زہد و ورع کی بناء پر قبول نہ کیا ان کے لڑکے کمسنی ہی میں انتقال کر گئے۔ صرف محمد بن علی بن شیخ الاسلام پھلے پھولے اور ممتاز عالم ہوئے۔

چوتھے بیٹے ابراہیم مشہور صاحب درس ہوئے، ابن بشر نے ان سے کمسنی میں ۱۲۲۴ھ میں "کتاب التوحید" پڑھی تھی، قضا سے الگ رہے[3]۔

شیخ کے ممتاز شاگردوں میں ان کے پوتے عبدالرحمٰن بن حسن بن شیخ الاسلام بھی نجد کے چند ممتاز عالموں میں شمار کیے جاتے تھے۔ ان کے والد شیخ کی زندگی ہی میں انتقال کر چکے تھے۔ کمسنی میں اپنے دادا سے کسب علم کیا اور شیخ کے ممتاز شاگردوں احمد بن ناصر بن عثمان بن معمر (ف ۱۲۲۵ھ) اور عبدالعزیز بن عبداللہ الحصین الناصری (م ۱۲۳۷ھ) کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا۔ شیخ عبدالرحمٰن بن حسن کی حیثیت اپنے خاندان میں علمی مجدد کی ہے۔ ان کا علمی مرتبہ شروع سے مسلم تھا۔ امیر سعود بن عبدالعزیز (ف ۱۲۲۹ھ) اور امیر عبداللہ بن سعود (مصلوب ۱۲۳۴ھ) کے عہد میں درعیہ کے قاضی رہے۔ شیخ حسین بن شیخ الاسلام کی وفات (۱۲۲۵ھ) کے بعد اس خاندان کے ان چار[4] افراد میں یہ بھی تھے جن کی علمی حیثیت مسلم تھی

---

[1] عنوان المجد: ۱، ۹۳، ۲۱۵۔

[2] ملاحظہ ہو کچی فہرست HAND LIST نمبر ۲۶۲۵۔ [3] عنوان ۱، ۹۳

[4] اساطین اربعہ جن کا ذکر اوپر آیا اسی ترتیب سے عزت وقدر کے مستحق سمجھے جاتے تھے۔ عبداللہ بن الشیخ علی بن حسین بن الشیخ، عبدالرحمٰن بن الشیخ، سلیمان بن عبداللہ بن الشیخ۔

اور پایۂ تخت (درعیہ) کے قضا کا کام جن کے سپرد تھا۔

سقوط درعیہ کے وقت (۱۲۳۳ھ) مصر چلے گئے تھے، بلکہ جلاوطن کر دیئے گئے تھے، جب حالات استوار ہوئے تو ۱۲۴۱ھ میں نجد واپس آئے، جہاں ان کی ذات سے پھر ایک بار علم کی گرم بازاری ہوئی اور سینکڑوں اشخاص ان کے درس میں شریک ہو کر کامیاب نکلے خود شیخ الاسلام کے خاندان کے بیسیوں افراد ان سے مستفیض ہوئے[1]۔ ترکی بن عبد اللہ (مقتول ۱۲۴۹ھ / ۱۸۳۴ء) اور فیصل بن ترکی (ف ۱۲۸۲ھ / ۱۸۶۵ء) کے عہد میں قاضی القضاۃ اور خواص و عوام کا مرجع بنے رہے۔ ترکی بن عبد اللہ بن محمد بن سعود (مقتول ۱۲۴۹ھ) کی خاص مجلسوں میں درس کی خدمت انہی کے سپرد تھی۔ عام طور پر تفسیر "ابن جریر" کا درس ہوتا۔ فیصل بن ترکی کے عہد میں بھی درس و ارشاد کی خدمت انہی کے سپرد تھی۔ سقوط درعیہ سے پہلے اساطین اربعہ کی دھوم تھی۔ حالات استوار ہونے کے بعد امیر ترکی بن عبد اللہ کے عہد میں صرف عبد الرحمٰن بن حسن بن الشیخ اور علی بن حسین الشیخ رہ گئے۔ ترکی اور فیصل دونوں کے ایام حکومت میں عبد الرحمٰن بن حسن اور علی بن حسین کے ساتھ ساتھ عبد الرحمٰن بن حسین کے ساتھ ساتھ عبد الرحمٰن بن الشیخ اور عبد الملک بن حسین کے نام بھی بار بار آتے ہیں[2]۔ لیکن فیصل بن ترکی کے آخری دور میں (۱۲۵۶ھ) کے بعد صرف عبد الرحمٰن بن حسن بن الشیخ کا نام خاص طور پر آتا ہے اور پھر فیصل کے بالکل آخری دور میں ان کے صاحبزادے عبد اللطیف ابن عبد الرحمٰن قضاء اور تدریس پر فائز نظر آتے ہیں۔ علی بن حسین بن الشیخ نے کافی عمر پائی اور غالباً فیصل کے وسط عہد حکومت (تقریباً ۱۲۶۰ھ) میں رحلت کی۔ بہر حال فیصل بن ترکی کے آخری زمانۂ حکومت میں یہ سب سے زیادہ محترم اور مخدوم تھے۔ بڑی عمر پائی، ابن بشر نے اپنی کتاب ۱۲۰۷ھ میں لکھی۔ اور ۱۲۶۷ھ کے حوادث پر ختم کی ہے۔ اس وقت یہ زندہ تھے۔ پالگریو نے اپنی

---

[1] عنوان: ۲، ۷۳، ۶۵، ۸۸

[2] TIVE OF A YEARS JOURNEY THOUG CENTRRAL AND EAST ARABIA

سیاحت کے دوران میں (۱۲۷۶ھ/ ۱۸۶۰ء) ریاض میں ان سے اور ان کے صاحبزادے عبداللطیف سے ملاقات کی تھی[1] لیکن اسے غلط فہمی یہ ہوئی کہ وہ انہیں عبداللہ ابن الشیخ کا فرزند سمجھا، ۱۲۸۵ھ میں بڑی عمر پا کر وفات پائی۔

ابن بشر نے ان کی متعدد تالیفات اور رسالوں کا ذکر کیا ہے، سلیمان بن عبداللہ بن الشیخ (مقتول ۱۲۳۳ھ) کی غیر مکمل شرح کتاب التوحید کی تکمیل بھی ان کے قلم سے ہوئی تھی، جو "فتح المجید فی شرح کتاب التوحید" کے نام سے بار بار چھپ چکی ہے[2]۔

"فتح المجید" کے علاوہ ان کی دوسری کتاب "قرۃ عین الموحدین فی تحقیق دعوۃ الانبیاءِ والمرسلین" بھی چھپ گئی ہے، یہ اصل میں "کتاب التوحید" ہی کے حواشی ہیں۔ محمد حامد الفقی (جنہوں نے "فتح المجید" کا تازہ ایڈیشن شائع کیا ہے) نے "فتح المجید" کے حواشی میں "قرۃ عین الموحدین" کے اقتباسات بہ کثرت دیئے ہیں۔ ان کا ایک مختصر رسالہ "عنوان المجد" میں منقول ہے[1]۔ ابن بشر نے ان کے متعدد خطوط کے اقتباسات بھی دیئے ہیں۔ "مجموعۃ التوحید" المکبۃ (۱۳۴۳ھ) میں بھی ان کے حسب ذیل تین رسالے شامل ہیں:۔

۱۔ رسالۃٌ فی جواب الجھمیۃ ص ۳۶ - ۳۲

۲۔ رسالۃٌ فی حکم موالاۃ اہل الاشراک ص ۱۶۹ - ۱۵۷

۳۔ بیان المحجۃ فی الرد علی صاحب اللجۃ ص ۲۵۲ - ۲۰۵

ان کے صاحبزادوں میں محمد بن عبدالرحمٰن بن حسن سقوطِ درعیہ کے وقت اپنے دوسرے اہل خاندان کی طرح قتل کیے گئے[2]۔

عبداللطیف بن عبدالرحمٰن ان کے جانشین ہوئے، یہ صغر سنی ہی میں سقوطِ درعیہ کے وقت مصر چلے گئے تھے۔ اپنے والد اور دوسرے اہلِ علم سے تحصیل کی۔ ۱۲۶۴ھ میں نجد واپس

---

[1] عنوان: ۲، ۲۳ - ۲۶، ۔ [2] عنوان: ۱، ۲۰۸

آ گئے اور اپنے ساتھ کتابوں کا بڑا ذخیرہ لائے آتے ہی اپنے والد کے دستِ راست بن گئے اور علمی و تبلیغی کاموں میں ان کا ہاتھ بٹانا شروع کیا۔ سنہ ۱۲۶۲ھ تک فیصل بن ترکی (ف ۱۲۸۲ھ) کی مجلسوں میں عبد الرحمٰن بن حسن مدرس اور واعظ کی حیثیت سے نظر آتے ہیں۔ سنہ ۱۲۶۵ھ میں عبد اللطیف بن عبد الرحمٰن، قاضی، امام، مدرس ہر حیثیت سے آگے آگے دکھائی دیتے ہیں۔ ابن بشر ان کے درس تفسیر کا بہت مداح ہے[1]۔ پالگریو نے ۱۸۶۲ء/۱۲۷۹ھ میں ان سے ملاقات کی تھی۔ اس وقت ان کی عمر چالیس کے لگ بھگ ہوگی، یہ پایۂ تخت ریاض کے قاضی تھے[2]۔ ان کی کتاب "منہاج المقدیس والتاسیس فی الرد علی المبطل داؤد بن سلیمان بن جرجیس" کا ذکر آگے آئے گا۔ ان کا ایک مختصر رسالہ مجموعۃ الہدیۃ السنیۃ" (ص ۴۸ - ۴۰) کے ضمن میں بھی طبع ہو چکا ہے۔ اس میں شیخ الاسلام کی مختصر سیرت بیان کی گئی ہے۔ سال وفات تحقیق کے ساتھ معلوم نہ ہو سکا۔ ایک نجدی عالم[3] اور سیاح کے بیان کے مطابق انہوں نے سنہ ۱۳۰۲ھ میں رحلت کی۔

شیخ عبد الرحمٰن بن حسن کے ایک دوسرے صاحبزادے اسحٰق بن عبد الرحمٰن بن حسن کا ذکر اب تک کسی تذکرہ میں نہیں ملا لیکن ہمیں ان سے واقفیت عجیب دلچسپ طریقہ پر ہوئی ہے۔ شوال (سنہ ۵۹ھ) میں وطن جانا ہوا (اوگانواں ضلع پٹنہ) اور اپنے خاندانی کتاب خانہ کی خستہ حال کتابوں کا جائزہ لینے لگا، تو صیانۃ الانسان عن الشیخ دحلان کا ایک نسخہ ملا جس کے پہلے ورق پر یہ عبارت خالص عربی خط میں لکھی ملی "فی ملک الحقیر الفقیر اسحٰق بن عبد الرحمٰن بن حسن بن محمد النجدی الحنبلی عفی اللہ عنہم"۔

---

[1] عنوان: ۱، ۱۱۲، ۲۲۱ - [2] پالگریو: ۱، ۲۷۹

[3] شیخ عمران بن عمران، ساکن ریاض (نجد)

میری خوشی کا کیا کہنا! الٹنے پلٹنے پر آخر میں اسی خط میں ایک لمبا نوٹ ملا، جس سے ان کے علم کا بھی پتہ چلتا ہے، صرف اسحاق کا لفظ صاف طور پر پڑھا جاتا ہے۔

نہیں کہا جا سکتا کہ یہ کتاب ہمارے ہاں کس طرح پہنچی؟ قرین قیاس یہ ہے کہ عاجز کے نانا مولانا عبد الصمدؒ (ف ۱۳۱۸ھ) سے ان کے تعلقات ہوں گے۔ مولانا عبد الصمدؒ ایک جید اہلِ حدیث عالم تھے اور وقت کے مشہور اہلِ حدیث عالموں سے ان کے تعلقات دوستانہ اور برابری کے تھے تفتیش سے پتہ چلا کہ یہ اسحاق بن عبد الرحمٰن بن حسنؒ ہندوستان رہے تھے اور مولانا سید نذیر حسین صاحب سورج گڈھی مونگیری، دہلویؒ (ف ۱۳۲۰ھ) نواب صدیق حسن خاں صاحبؒ (ف ۱۳۰۷ھ) اور مولانا محمد بشیر صاحب سہسوانیؒ (ف ۱۳۲۶ھ) سے استفادہ بھی کیا تھا ۱۳۳۰ھ کے لگ بھگ وفات پائی۔

موجودہ عہد میں اس خاندان کے عالموں میں محمد بن عبد اللطیف بن عبد الرحمٰن سب سے ممتاز ہیں، ان کا ایک رسالہ (مؤلفہ ۱۳۳۹ھ) "الدرر السنیۃ" کے مجموعے میں شامل ہے۔ ان کی عمر اس وقت اسّی کے قریب ہوگی (روایت شیخ عمران بن محمد) محمد حامد الفقی نے "فتح المجید" کے دیباچے میں اس خاندان کے دو معاصر عالموں عبد اللہ بن حسن[1] آل الشیخ (رئیس قضاۃ، مملکۂ سعودیہ) اور محمد بن ابراہیم بن عبد اللطیف کے نام لیے ہیں۔

---

[1] عبد اللہ بن حسن بن حسین بن علی بن محمد بن عبد الوہاب (روایت شیخ عمران)

دوسرا باب

سیاسی برتری

شیخ کی زندگی میں اور ان کی وفات کے بعد نجد اور اطرافِ نجد میں جو خوشگوار تبدیلیاں ہوئیں وہ سب ثمرہ تھیں، شیخ الاسلامؒ کی دعوت اور ان کے اخلاص کا۔ حقیقت یہ ہے کہ شیخ نے اہل نجد کی زندگی، عقائد اور اخلاق میں ایک غیر معمولی انقلاب نہیں بلکہ کایا پلٹ کر دی۔ خوش قسمتی سے انہیں محمد بن سعود (ف ۱۱۷۹ھ/۱۷۶۵ء)، عبدالعزیز بن محمد بن سعود (۱۱۷۹ھ/۱۷۶۵ء - ۱۲۱۸ھ/۱۸۰۳ء) اور سعود بن عبدالعزیز (۱۲۱۵ھ/۱۸۰۳ء - ۱۲۲۹ھ/۱۸۱۴ء) جیسے اولوالعزم مجاہد اور فرمانروا ملے جنہوں نے شیخ کے مشن کی تکمیل میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا۔

شیخ کی دعوت کے ساتھ ساتھ آل سعود کا نام بھی وابستہ ہوگیا ہے، اس لیے ہم مختصر طور پر آل سعود کی تاریخ کے ان اہم حصوں کو پیش کر دینا چاہتے ہیں، جن کا اس تحریک سے خاص اور بلاواسطہ تعلق ہے۔

محمد بن سعود[1]

امیر محمد بن سعود (ف ۱۱۷۹ھ/۱۷۶۵ء) نے دعوت کے پھولتے پھلتے ہی حرمین کو ایک وفد بھیجا۔ جس نے شریف مسعود بن سعید (۱۱۴۶ھ/۱۷۳۳ء - ۱۱۶۵ھ/۱۷۵۲ء) سے حج کی عام اجازت طلب کی اور علمائے حرمین سے مختلف فیہ مسائل پر گفتگو کی۔ ''مفتیانِ حرم'' کا رویہ افسوسناک رہا اور وفد کے اراکین گرفتار کر لیے گئے بعضوں

---

[1] نجد کی سیاسی تاریخ ہمارے دائرۂ بحث سے خارج ہے ہم صرف ان گوشوں کو اجاگر کر رہے ہیں، جن کا شیخ کی سرگرمیوں سے خاص تعلق تھا۔ نجد اور آل سعود کی تفصیلی تاریخ کے لیے ملاحظہ ہو:-

نے مشکل سے اپنی جان چھڑائی -

امتناع حج

یہ وحلان کا بیان ہے[1] جس کی دونوں کتابوں " خلاصۃ الکلام فی امراء البلد الحرام" اور "الدرر السنیۃ فی الرد علی الوہابیۃ" میں نہ تاریخیں صحیح درج ہیں نہ واقعات کی تدوین میں دیانتداری سے کام لیا گیا ہے - وحلان نے سال کی تعیین بھی نہیں کی - بہرحال اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس واقعہ سے پہلے اہل نجد کے خلاف امتناع حج کے احکام صادر ہو چکے تھے ، ابن بشر ۱۱۶۲ھ کے تحت اس قدر ذکر کرتا ہے[2]:-

" ۱۱۶۲ھ میں مسعود بن سعید شریف مکہ نے نجدی حاجیوں کو قید کر لیا اور ان میں سے کچھ مر گئے -"

شیخ الاسلام کی دعوت کا ظہور ۱۱۵۷ء کے بعد ہوا اور شہرت و مقبولیت ۱۱۶۰ھ کے بعد شروع ہوئی - اس لیے یہ قرین قیاس نہیں کہ ۱۱۶۲ھ سے پہلے نجد کے حجاج بیت الحرام کی زیارت سے روکے گئے ہوں - یہ قرائن بتاتے ہیں کہ حاجیوں کی گرفتاری کے اسی

(بقیہ حاشیہ ص ۶۰) (۱) عنوان المجد (ابن بشر)

(۲) عجائب الآثار (جبرتی) جلد ۳ ، ۴

(۳) تاریخ نجد (آلوسی) ص ۱۰۴ - ۹۰

(۴) حاضر العالم الاسلامی ، ج ۴ ص ۱۷۳ - ۱۶۱ (امیر شکیب ارسلان)

(۵) انسائیکلوپیڈیا آف اسلام (مقالہ : ابن سعود)

(۶) ARABIA (از فلبی) جو بہت مفصل اور کافی سے زیادہ ہے - امین ریحانی کی کتابیں بھی عربی اور انگریزی دونوں زبانوں میں مشہور اور مقبول ہیں ، مآخذ کے سلسلے میں ان کے علاوہ اور دوسری کتابوں کا ذکر آئے گا -

[1] الدرر السنیۃ : ص ۴۴ - [2] عنوان المجد : ۱ ، ۲۳

واقعہ سے امتناعِ حج کا آغاز ہوا اور درمیانی وقفوں کے ساتھ یہ پابندی اہلِ نجد پر برابر عائد رہی۔ ۱۱۸۳ھ، ۱۱۸۵ھ، ۱۱۹۷ھ میں خاص طور پر اجازت ملی اور نجد کے عالم و عامی بڑی تعداد میں زیارت بیت اللہ سے مشرف ہوئے۔ لیکن یہ "اجازتیں" اتفاقی تھیں۔ سعود بن عبدالعزیز کے داخلۂ حرم[۱] سے پہلے اہلِ نجد کو کبھی بلا روک ٹوک حج و زیارت کا موقع نہ ملا۔ تفصیل ذیل میں ملاحظہ ہو۔

عبدالعزیز بن محمد بن سعود[۲]

(الف) امیر محمد بن سعود کی وفات عین دعوت کے شباب میں ہوئی۔[۳] عبدالعزیز بن محمد بن سعود جانشین ہوا۔ مارگولیوتھ کے بیان کے مطابق ۱۱۷۹ھ / ۱۷۶۶ء میں ایک وفد مکہ گیا، جہاں ان کی خاطر مدارات ہوئی۔ شریف نے میزبانی کی اور وفد نے علماء کو یقین دلایا کہ ان کے عقائد (امام اہل سنت) احمد بن محمد بن حنبل رح سے الگ نہیں۔

---

[۱] سعود بن عبدالعزیز بن محمد بن سعود کو ۱۲۱۸ھ / ۱۸۰۳ء میں فاتح کی حیثیت سے مکہ مکرمہ کی زیارت نصیب ہوئی۔

[۲] بعض لکھنے والے عبدالعزیز محمد بن سعود کو شیخ الاسلام کا نواسہ بتاتے ہیں (فلبی: ص ۴۲ - ۴۱، ڈکشنری آف اسلام: ص ۶۶) لیکن یہ صحیح نہیں۔ عام طور پر مؤرخ لکھتے ہیں کہ امیر محمد بن سعود سے شیخ الاسلام رح کی ایک صاحبزادی منسوب تھیں لیکن شیخ الاسلام رح کی درعیہ میں اقامت ۱۱۵۷ھ میں ہوئی ہے اور یہ شادی اس کے بعد ہی ہوئی ہوگی۔ دوسری طرف ہمیں موثق ذرائع سے یہ معلوم ہے کہ امیر عبدالعزیز ۱۱۶۰ھ میں سنِ شعور کو پہنچ چکے تھے اور شوکانی رح (البدر الطالع: ۲۶۳) کے بیان کے مطابق سعود بن عبدالعزیز کی ولادت ۱۱۶۰ھ ۱۱۶۳ھ میں ہو چکی تھی۔ اس لیے شیخ الاسلام رح اور امیر بن سعود کے رشتہ مصاہرت کو مان بھی لیا جائے۔ (ابن غنام اور ابن بشر دونوں میں سے کسی نے اس رشتہ کا ذکر نہیں کیا ہے) تو عبدالعزیز بن محمد سعود شیخ کے نواسے نہیں ہو سکتے۔ اس کے برعکس BRYDGES لکھتا ہے کہ خود عبدالوہاب (؟ ابن عبدالوہاب) نے محمد بن سعود کی لڑکی سے شادی کی تھی (ص ۱۰۷) نیز وہ یہ بھی لکھتا ہے کہ عبدالعزیز بن محمد بن سعود نے عبدالوہاب (؟ ابن) کی لڑکی سے شادی کی جن کے بطن سے سعود بن عبدالعزیز پیدا ہوا۔ پتہ نہیں صحیح کیا ہے؟

[۳] ۱۱۷۹ھ / ۱۷۶۷ء

یہ مارگولیوتھ کا بیان ہے، ابن غنام، ابن بشر اور فلبی ۱۱۷۹ھ میں کسی وفد کا ذکر نہیں کرتے پتہ نہیں اس کا ماخذ کیا ہے، ابن غنام اور ابن بشر کے سکوت کے بعد مارگولیوتھ کے بیان پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔ احمد زینی دحلان (الدرر السنیۃ ص ۴۴) کے بیانات بھی اس سلسلہ میں حد درجہ متعارض اور ناقابل وثوق ہیں۔

۱۱۸۳ھ / ۱۷۶۹ء امتناع کے بعد پہلا حج

۱۱۸۳ھ / ۱۷۶۹ء میں اشراف حجاز کے ایک دستہ سے کہیں موحدین کی مڈبھیڑ ہو گئی۔ شریف منصور دستہ کا سردار گرفتار ہوا۔ امیر عبد العزیز نے اسے بلا فدیہ کے رہا کر دیا جس کا اچھا اثر پڑا اور معاوضہ میں شریف[1] مکہ نے حج کی اجازت دی اور موحدین کی ایک کافی تعداد نے اس

---

[1] انگریز اور یورپی مؤرخ مکہ کے حاکم کو GRAND SHARIF اور خاندان کے دوسرے افراد کو صرف شریف کہتے ہیں۔ عربی میں یوں تو "شریف" کا لفظ عام حسنی سادات کے لیے بھی مستعمل ہوتا ہے، مگر شریف مکہ کا لفظ مکہ کے حاکم ہی کے لئے بولا جاتا ہے۔ اشراف کی تاریخ کے لیے دحلان کی کتاب "خلاصۃ الکلام فی امراء البلد الحرام" ملاحظہ کی جا سکتی ہے، گو زیادہ قابل اعتماد نہیں۔

محمد لبیب البتنونی کی "الرحلۃ الحجازیۃ" (ص ۷۳-۸۱) میں بھی اشراف مکہ کی مختصر تاریخ دی گئی ہے۔

برک ہارٹ کی TRAVELE IN ARABIA (۱، ۴۴۴-۲۰۵) میں بھی "مکہ کی حکومت" پر ایک پر از معلومات باب ہے ہوگارتھ کی A HISTORY OF ARABIA میں بھی اشراف مکہ پر ایک باب ہے، مگر مختصر۔ ہماری تحریک کا تعلق جن اشراف سے ہا، ان کے نام اور سنین تولیت یہ ہیں:

(۱) مسعود بن سعید (۱۱۴۶ھ) (۲) مساعد بن سعید (۱۱۶۵ھ) (۳) مساعد بن سعید (۱۱۷۴ھ) (۵) عبد اللہ بن سعید (۱۱۸۴ھ) (۶) احمد بن سعید (۱۱۸۴ھ) (۷) عبد اللہ بن حسن (۱۱۸۴ھ) (۸) احمد بن سعید (۱۱۸۴ھ) (۹) سرور بن مساعد (۱۱۸۶ھ) (۱۰) عبد المعین بن مساعد (۱۱) غالب بن مساعد (۱۲۰۲ھ) (۱۲) یحییٰ بن سرور (۱۲۲۸ھ) الخ

سے فائدہ اٹھایا :-

"......... فاغتنم لذلك من المسلمين طائفة وسارت للحج آمنة[1]"

یہ اجازت بہر حال اسی سال تک محدود رہی، البتہ اس سے آئندہ گفت و شنید اور بحث و تمحیص کا دروازہ کھل گیا۔

پہلا نجدی وفد ۱۱۸۵ھ / ۱۷۷۱ء

۱۱۸۵ھ / ۱۷۷۱ء میں شیخ اور عبدالعزیز نے احمد بن سعید (۱۱۸۴ھ - ۱۱۸۶ھ) والیٔ مکہ کو بھیجے۔ اس نے خط و کتابت کے ذریعہ ان (شیخ اور امیر عبدالعزیز) سے ایک عالم و فقیہ کے بھیجنے کی فرمائش کی تھی جس سے علماء مکہ ان کی دعوت اور مسلک پر گفتگو کر سکیں، تو شیخ اور عبدالعزیز نے شیخ عبدالعزیز بن الحصین کو ایک خط دے کر بھیجا جس کا مضمون یہ تھا...... جن علماء (مکہ) نے ان سے گفتگو کی ان کے نام یہ ہیں: یحییٰ بن صالح الحنفی، عبدالوہاب بن حسن الترکی (سلطان کے مقرر کردہ مفتی) اور عبدالغنی بن ہلال۔ تین مسئلوں (تکفیر[1]، ہدم قباب[2]، بزرگوں[3] سے مراد یں مانگنا) پر وہ شیخ عبدالعزیز کی دلیلوں سے مطمئن ہوگئے اور شیخ عبدالعزیز اعزاز و توقیر کے ساتھ واپس کیے گئے[2]۔

ابن بشر[3] نے اس وفد کا صرف سرسری تذکرہ کیا ہے، فلبی[4] نے اس وفد کا تفصیلی ذکر کیا ہے، اس کا ماخذ غالباً ابن غنام کی "روضۃ الافکار" ہی ہے، لیکن اس نے ۱۱۸۳ھ / ۱۷۶۹ء کے حج اور ۱۱۸۵ھ / ۱۷۷۱ء کے وفد کو خلط ملط کر دیا ہے، حالانکہ ابن غنام نے دونوں واقعے الگ

---

[1] روضۃ الافکار : ۲، ۹۱

[2] روضۃ الافکار : ۹۲ - ۹۱، محمد حامد فقی (ص ۷۵) نے یہ بھی لکھا ہے کہ :-

"شیخ عبدالعزیز بن حصین کا اثر دیکھ کر شریف احمد بن سعید کے اقارب اس سے بگڑ گئے اور سبھوں نے مل کر اسے امارت سے الگ کر دیا۔ غالباً علماء سوء کا اس میں ہاتھ رہا ہوگا۔"

پتہ نہیں، ان کا ماخذ کیا ہے۔ [3] ۱ : ۵۹ - [4] ص ۲۴-۲۳

الگ ذکر کیے ہیں۔

وفد کے سرگروہ شیخ عبد العزیز بن عبد اللہ بن الحصین کا شمار شیخ الاسلامؒ کے مخصوص شاگردوں میں تھا۔ شیخ کو خود ان پر بڑا اعتماد تھا، شیخ نے اپنی زندگی میں انہیں دوبارہ رئیس وفد کا بنا کر مکہ مکرمہ بھیجا۔ شیخ کے بعد امیر عبد العزیز (ف ۱۲۱۸ھ / ۱۸۰۳ء) سعود بن عبد العزیز (ف ۱۲۲۹ھ / ۱۸۱۴ء) اور عبد اللہ بن سعود (مصلوب ۱۲۳۴ھ / ۱۸۱۹ء) تینوں کے عہدِ حکومت میں منصبِ قضا پر فائز رہے۔ سقوطِ درعیہ کے وقت (۱۲۳۳ھ) جب کہ یہ بہت ضعیف ہو چکے تھے، ابراہیم پاشا ان کے ساتھ بری طرح پیش آیا اور سخت کلامی بھی کی[۱]۔ فتح اور دنیوی سربلندی کا نشہ ہی کچھ ایسا ہوتا ہے۔ غنیمت ہے کہ اوروں کی طرح انہیں پھانسی نہیں دی گئی۔ ۱۲ رجب ۱۲۳۷ھ (۴ اپریل ۱۸۲۲ء) کو وفات پائی[۲]۔

قحط سالی اور حج کی عام اجازت ۱۱۹۷ھ / ۱۷۸۵ء

"۱۱۹۷ھ میں عبد العزیز (حرسہ اللہ تعالیٰ) نے سرور والیٔ مکہ مشرفہ کو گھوڑے، سواریاں اور مختلف چیزیں ہدیۃً بھیجیں۔ اس تمام تعظیم و تکریم اور ہدایا سے اصل غرض اہلِ دین و اسلام (یعنی اہلِ نجد، اتباعِ شیخ الاسلام مدظلہ العالی) کے لیے ادائے فرض (التزام الرکن الخامس) کی عام اجازت حاصل کرنا تھی، جس سے وہ سالہا سال سے روک دیئے گئے تھے اور جس کی بجا آوری کے لیے ان کے دل تڑپ رہے تھے، تو اس سال سب لوگوں نے حج کیا، کوئی تین سو آدمی ہوں گے[۳]۔"

ابنِ بشر نے اس کا بالکل ذکر نہیں کیا۔ فلبی نے "اجازت" اور اس کے اسباب و نتائج پر مفصّل گفتگو کی ہے۔ ۱۱۹۷ھ / ۱۷۸۵ء کی قحط سالی کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے:۔

---

[۱] عنوان: ۱، ۱۹۱۔ [۲] مزید حالات اور شاگردوں کی تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: عنوان المجد: ۱، ۹۴۔ ۹۱، ۲۳۲، ۲۲۳۔ [۳] روضۃ الافکار: ۲، ۱۳۴

...... تاہم (یعنی امیر عبدالعزیز کی تمام کوششوں کے باوجود) اس قحط سالی سے جو دو سال تک رہی، پورے عرب کو کافی نقصان پہنچا۔ قابلِ لحاظ بات یہ ہے کہ جب شریف اعظم سرور نے وہابی حاکم کو اس پابندی کے اٹھائے جانے کی اطلاع دی[1]، جو ان کے آزادانہ حج پر چند سال پہلے عائد کر دی گئی تھی، تو قحط سالی کے سبب سے صرف تین سو آدمی فائدہ اٹھا سکے۔ وہابیوں کو حج کی دوبارہ اجازت اس دَور کی عربی تاریخ میں خاصی اہمیت رکھتی ہے سرور عملاً قسطنطنیہ کے برائے نام TITULAR خلیفہ کے اقتدار سے بالکل آزاد ہو چکا تھا اور اب اس نے عسیر اور نجد کے حدود کی طرف تاخت شروع کر دی تھی۔ وہابیوں کے خلاف امتناع کے حکم کو بھی اس نے اپنی برتری منوانے کا ذریعہ بنانا چاہا تھا لیکن وہابیوں نے اس کی برتری تسلیم نہیں کی۔ اور امتناعِ حج کا بدلہ انھوں نے یہ لیا کہ عراق و فارس کے حاجیوں کے قافلے جو وہابی علاقے سے گزرتے تھے، نجدی دستور کی چھیڑ چھاڑ کا شکار ہونے لگے، یہ شریف سرور کی طاقت سے باہر تھا کہ ان قافلوں کی حفاظت کا ذمہ لے سکے، نتیجہ یہ ہوا کہ بغداد کے ترکی پاشا نے قافلوں کی روانگی روک دی اس لیے کہ فارس کی حکومت صحرا کی تکلیفوں کا الزام پاشائے بغداد ہی پر ڈالتی تھی۔ ان دنوں حجاز کا سارا دار و مدار انہیں قافلوں پر تھا، جو خشکی کے ذریعہ

---

[1] فلبی (ص ۳۸) کے بیان سے ایسا مترشح ہوتا ہے کہ شریف سرور (۱۱۸۶ھ۔ ۱۲۰۲ھ) نے از خود اجازت دی تھی، حالانکہ ابن غنام کے مندرجہ بالا بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ امیر عبدالعزیز کی سلسلہ جنبانی پر یہ اجازت ملی تھی:۔ (قصدہ بذلک التشریف والاکرام واھدائہ ...... الرخصۃ لاھل الدین والاسلام فی اداء واجب الافتراض ...... الخ

حج کو آتے تھے، مکہ اور مدینہ کے تاجروں نے تنگ آکر شریف کو نجدی حکومت سے تعلقات استوار کرنے پر مجبور کیا۔ سرور کے لیے جھکنے کے سوا کوئی چارۂ کار نہ رہا اور گھوڑوں اور اونٹوں کا تحفہ جو وہابی حاکم نے قحط سالی کے سال شریف کو بھیجا اس سے دونوں حکومتوں کے تعلقات کی شگفتگی سب لوگوں پر ظاہر ہوگئی ...... الخ۔

لیکن یہ اجازت بھی عارضی ثابت ہوئی۔[1]

دوسرا نجدی وفد ۱۲۰۴ھ / ۱۷۹۰ء

شریف سرور کا انتقال ۱۲۰۲ھ میں ہوا، اس کے بعد عبدالمعین بن مساعد والی ہوا، پھر غالب بن مساعد امیر مقرر ہوا۔ یہی شریف غالب ہے جس کے عہد میں اہلِ نجد اور حجازیوں اور مصریوں کے درمیان معرکہ آرائیاں ہوئیں۔ مؤرخوں کے بیانات سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس کشمکش سے بچنا چاہتا تھا، لیکن علماء نے صلح نہ ہونے دی۔

واقعہ کچھ بھی ہو، شریف غالب (۱۲۰۲ھ - ۱۲۳۸ھ) کی معاملہ فہمی کا بڑا ثبوت یہ ہے کہ اس نے زمامِ حکومت ہاتھ میں لینے کے کچھ ہی بعد (دو برس بعد) امیر عبدالعزیز سے ایک ایسے عالم کی فرمائش کی جو شیخ الاسلامؒ کی دعوت پر گفتگو کر سکے۔ امیر عبدالعزیز نے خوشی خوشی دعوت قبول کی اور شیخ عبدالعزیز بن الحصین کو (جو پہلے وفد کے رئیس بنا کر بھیجے گئے تھے) اس خدمت پر مامور کیا۔ خود شیخ الاسلامؒ نے اپنے دستِ خاص سے لکھ کر ایک خط دیا۔ جس میں پہلے وفد

---

[1] ARABIA: ص ۳۹ - ۳۸ MORDTMANN (مقالہ ابن سعود: انس اسلام) کے بیان کے مطابق سرور کی دی ہوئی اجازت غالب نے ۱۲۰۲ھ میں چھین لی۔ عام طور پر مؤرخ لکھتے ہیں کہ اجازتیں عارضی رہیں اور اہل نجد پر حج کے سلسلہ میں امتناعی احکام جاری رہے تا آنکہ ۱۲۰۵ھ سے باضابطہ جنگ شروع ہوگئی۔ (الرحلۃ الحجازیۃ: ص ۸۸)

کے حوالے کے ساتھ۔ وہ دلیلیں تفصیل سے بیان کی گئیں جن سے اس وقت علمائے مکہ مطمئن ہو گئے تھے۔ غالب نے شیخ عبدالعزیز بن الحصین کا پُرتپاک خیر مقدم کیا۔ دیر تک گفتگو کی اور ان کے دلائل کی اہمیت اور سچائی تسلیم کی۔ لیکن مقامی علماء کے بہکانے سے وہ اپنے خیال سے پھر گیا۔ "فقیہان حرم" نے اسے یہ سوجھایا کہ "تم نے ابن سعود کی اطاعت قبول کی تو شریفی امارت پر ابن سعود کا قبضہ ہو جائے گا" بات لگتی ہوئی تھی، غالب کے دل سے لگ گئی اور نجدی اقتدار کے ہوّے۔ نے اُسے قبول حق سے باز رکھا جس کا خمیازہ تمام دنیائے اسلام کو بھگتنا پڑا۔ شیخ عبدالعزیز نے اصرار بھی کیا کہ مقامی علماء کی ایک مجلس ترتیب دی جائے اور مختلف فیہ مسئلوں پر کھل کر گفتگو کی جائے۔ لیکن مقامی علماء اس پر راضی نہ ہوئے اور انہوں نے صاف صاف اعلان کیا:۔

"ان وہابیوں کے ساتھ کوئی گفت وشنید بے کار ہے کہ ان کے عقائد ہمارے اسلاف کے عقائد کے بالکل برعکس ہیں"[1]

اگر فقیہان حرم کا رویہ ناعاقبت اندیشانہ نہ ہوتا اور شریف غالب اور امیر عبدالعزیز کے درمیان مفاہمت ہو جاتی تو مسلمانوں کا کتنا قیمتی خون ضائع ہونے سے بچ جاتا؟

تعجب ہے کہ ابن بشر نے اس قدر اہم واقعہ کا ذکر نہیں کیا۔

تیسرا نجدی وفد ۱۲۰۵ھ / ۱۷۹۷ء

دوسرے وفد کی ناکامی کے بعد طرفین میں چھیڑ چھاڑ شروع ہو گئی۔ ۱۲۰۵ھ / ۱۷۹۱ء میں خود غالب نے پہل کی۔ یہ سلسلہ عرصہ تک جاری رہا۔ درمیان میں صلح بھی ہوتی رہی۔ اس اثناء میں نجدی فوجیں جزیرۃ العرب کے باقی علاقوں میں اپنا اثر ونفوذ بڑھاتی رہیں۔ تاآنکہ ۱۲۱۱ھ میں انہوں نے احساء کے پاس جزیرہ علماء پر حملہ کیا اور کامیاب لوٹے[2]۔ نجدی طاقت کے بڑھتے ہوئے اثر کو دیکھ

---

[1] روضۃ الافکار: ۲، ۱۶۲ - ۱۶۳

[2] عنوان المجد: ۱، ۱۱ -

کر شریف غالب نے ایک مرتبہ پھر سلسلہ جنبانی کی - امیر عبد العزیز کو ایک خط بھیجا اور ایک ایسے نجدی عالم کو بھیجنے کی درخواست کی جو موحدین کا مسلک اہل مکّہ کے سامنے پیش کر سکے ، پہلے دونوں وفد شیخ الاسلامؒ کی زندگی میں اور ان کی ہدایتوں کا نوشتہ ساتھ لے کر گئے تھے - تیسرے وفد کا مطالبہ ان کے انتقال (۱۲۰۶ھ) کے بعد ہوا - تاہم امیر عبد العزیز بن محمد بن سعود نے فوراً دعوت قبول کر لی ، اس لیے کہ اسے تبلیغ سے زیادہ کوئی چیز عزیز نہیں تھی - شیخ الاسلامؒ کے ایک ممتاز شاگرد شیخ احمد بن ناصر بن عثمان بن معمر اس خدمت پر مامور ہوئے - احمد بن ناصر اور ان کے ساتھی پہلے طواف سے فارغ ہوئے - اس کے بعد امیر عبد العزیز کے تحفے شریف کی خدمت میں پیش کیے - ان کا استقبال نہایت دوستانہ ہوا اور مسلسل کئی دنوں تک مقامی علماء سے گفتگو ہوتی رہی - آخر میں شیخ احمد بن ناصر کی خدمت میں کچھ سوالات پیش ہوئے اور تحریری جواب کا مطالبہ کیا گیا - شیخ احمد بن ناصر نے مفصل اور مدلل تحریری جواب دیا جو ایک رسالہ کی صورت میں " الفواکہ العذاب فی الرد علی من لم یحکم بالسنۃ والکتاب " کے نام سے چھپ گیا ہے[1] - اس رسالے میں خاص طور پر دو مسئلوں سے بحث کی گئی ہے :-

۱ - شفاعت اور استغاثہ

۲ - تارکین صلوٰۃ کی تکفیر اور ان سے قتال -

(آگے چل کر ان مسئلوں پر تفصیلی گفتگو ہو گی ، اس لیے یہاں اس رسالہ کے موضوع بحث کو چھیڑنا مناسب نہیں)

یہ مناظرہ رجب ۱۲۱۱ھ میں غالب کے سامنے بھری مجلس میں ہوا تھا - ابن غنام نے ۱۲۱۱ھ کے حوادث کے ضمن میں قلم بند کرتے ہوئے لکھا ہے :-

" وہ (علمائے مکہ مکرمہ) شیخ احمد بن ناصر کے دلیلوں کی قوت تسلیم کرنے

---

[1] ARABIA ص ۷۲ - ۷۱

کے باوجود قبول حق پر آمادہ نہ ہوئے :-

"انهم اعترفوا باستقامة حجه ومع ذلك جحدوا" الخ

ابن غنام نے پورا رسالہ بھی نقل کر دیا ہے[1]۔ فلبی[2] نے بھی اس وفد اور مناظرہ کی پوری روداد درج کی ہے۔ تعجب ہے کہ ابن بشر نے اس وفد کا بھی مطلق ذکر نہیں کیا۔

وفد کے رئیس شیخ احمد بن ناصر بن معمر کے متعلق بھی دو حرف لکھنا مناسب نہ ہوگا۔ پہلے اور دوسرے وفد کے رئیس شیخ عبدالعزیز الحصین (ف ۱۲۳۷ھ) کی طرح یہ بھی شیخ الاسلامؒ کی شاگردی کا شرف رکھتے تھے۔ شیخ الاسلامؒ کے علاوہ، ان کے بھائی سلیمان بن عبدالوہاب (ف ۱۲۰۸ھ) اور ان کے شاگرد و سیرت نگار ابن غنام (ف ۱۲۲۵ھ) سے بھی مستفید ہوئے تھے۔ درعیہ میں عرصہ تک عہدۂ قضا پر مامور رہے، امیر سعود بن عبدالعزیز (۱۲۱۸ - ۱۲۲۹) نے انہیں درس و افتاء کے لیے مکہ مکرمہ بھیجا تھا اور وہیں وفات پائی۔[3] (وسط ذی الحجہ ۱۲۲۵ھ آغاز جنوری ۱۸۱۱ء)

جنگ کے بعد صلح: ۱۲۱۳ھ

اب نجدی وہابیوں کی کامیابیاں اتنی بڑھیں کہ باب عالی کو بھی فکر دامنگیر ہوئی[4]۔ سلیمان

---

[1] روضة الافكار: ۲، ۲۲۶ - ۲۶۱ - [2] ARABIA ص ۷۲ - ۷۱ - [3] عنوان المجد، ۱، ۲۵۱

[4] ۱۳۱۲ھ میں غالب نے خاص طور پر دولت علیا کو وہابیوں کی "سرکوبی" کی طرف توجہ دلائی، لیکن دولت علیا نے کسی سرگرمی کا اظہار نہیں کیا۔

لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ اس سے پہلے سلیمان پاشا، بغداد کا حاکم، اہل نجد کے مقابلہ میں فوج کشی کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ اور اس کے بعد ۱۲۱۳ھ میں تو خود دحلان کے بیان کے مطابق سلیمان کے نائب علی پاشا نے ایسی چڑھائی کی تھی کہ "اگر ان کی زندگی نہ باقی ہوتی تو وہابیوں کا یقینی خاتمہ ہو گیا تھا۔ (خلاصة الكلام: ص ۲۲۶ -

پاشا، والئ بغداد کے ذمہ یہ مہم کی گئی۔ سلیمان نے ثوینی اور علی پاشا کی سرکردگی میں بالترتیب فوجیں[1] بھیجیں، جو ناکام واپس آئیں۔ پھر کیا تھا نجدی فوجیں عراق کی سرحد پر مسلسل دھاوے کرنے لگیں۔ امیر عبد العزیز نے بڑھ کر بحرین اور سواحل عمان پر قبضہ کر لیا، جو بصرہ اور بغداد کے ترک حاکموں کے حملوں کے باوجود مستحکم ہوتا گیا۔

نجدیوں پر امتناع حج کی پابندی اور بدلے میں ان کا عراق پر حملہ اور عراقی قافلے کی راہ میں رکاوٹیں ڈالنا، اشراف مکہ کے لیے ہمیشہ خلجان کا باعث رہا اور اسی دباؤ سے مجبور ہو کر انہوں نے بارہا حج کی اجازت دی اور وفود طلب کیے، پھر فوج کشی کی ٹھانی۔ غالب کا یہ رویہ برابر قائم رہا اور اس نے ۱۲۰۵ھ/۱۷۹۰ء، ۱۲۱۰ھ/۱۷۹۵ء اور ۱۲۱۳ھ/۱۷۹۸ء میں مسلسل تیاریوں کے بعد حملے کیے اور ہمیشہ ناکام[2] رہا۔ آخری سخت معرکہ ۱۲۱۲ھ[3] میں پیش آیا اور غالب کو خرمہ (تربہ کے قریب ایک مشہور گاؤں) کے مقام پر بری شکست ہوئی اور اس کے ہزاروں[1] آدمی کام آئے، تو اس کے لیے صلح جوئی اور حج کی اجازت دینے کے سوا کوئی چارۂ کار نہ رہا، دونوں علاقوں کے درمیان حد بندی کر دی گئی۔ عتیبہ، حرب اور عسیر کا شمالی علاقہ شریف کے حدود مملکت میں رہا۔ یہ صلح آخر جمادی الاولیٰ ۱۲۱۳ھ، دسمبر ۱۷۹۸ء میں ہوئی[4] اور ۱۲۱۳ھ سے ۱۲۱۵ھ تک نجدی حجاج اور ان کے ساتھ عراقی قافلے، امن و امان کے ساتھ فریضۂ حج کرتے رہے۔

---

[1] ۱۲۱۱ھ/۱۷۹۷ء اور ۱۲۱۳ھ/۱۷۹۹ء تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو، عنوان المجد: ۱/۱۰۷، ۱۰۹، ۱۱۸، قلبی: ص ۲۸۔

[2] عنوان المجد: ۱/۸۷، ۸۶، ۱۰۳، ۱۰۷، ۱۱۲، ۱۱۳، قلبی: ص ۵۳-۵۱، ۶۴، ۷۳-۷۴۔

[3] یہ معرکہ جو "وقعة الخرمة" کے نام سے مشہور ہے، شوال ۱۲۱۲ھ مارچ اور اپریل ۱۷۹۸ء میں پیش آیا۔ غالب شکست کھا کر ۳/ ذی القعدہ۔ ۱۹/ اپریل ۱۷۹۸ء کو مکہ واپس ہوا (خلاصۃ الکلام ص ۲۶۷)

[4] خلاصۃ الکلام: ص ۲۶۸۔

حج (۱۲۱۳ھ) خرمہ کے واقعہ کے بعد شریف نے عبدالعزیز کے پاس قاصد بھیجا اور صلح کی خواہش کی، جسے امیر نے قبول کیا اور شریف نے اہلِ نجد کو حج کی اجازت دی۔

اسی سال نجد کا ایک قافلہ حج سے مشرف ہوا، جس میں شیخ الاسلامؒ کے دو فرزند علی بن محمد اور ابراہیم بن محمد اور ابراہیم بن محمد بھی تھے[1]۔ دونوں کے درمیان عہد و پیمان مکمل ہو گئے۔ جنگ کی موقوفی اور امن و امان کا اعلان کر دیا گیا۔ وہابیوں کو حج بیت اللہ کی اجازت ملی اور لوگوں کو ان کے ساتھ کسی قسم کا تعرض کرنے سے روک دیا گیا تو وہ ہر طرف سے مکہ کی طرف لپکے۔ اللہ تعالیٰ کی بھی عجب شان ہے[2]۔

احمد وحلان، احمد بن ناصر کے حج کا بھی ذکر کرتا ہے، لیکن ابن بشر دوسرے اعیان کے ضمن میں ان کا نام نہیں لیتا۔

اسی سال خود امیر عبدالعزیز یا سعود بن عبدالعزیز حج سے مشرف نہ ہو سکے۔ سلیمان پاشا نے اپنے نائب علی پاشا کی سرکردگی میں عظیم الشان فوج ان کے مقابلہ کے لیے بھیجی تھی۔ اس مہم کی تیاریوں میں دونوں باپ بیٹے الجھے رہے۔ یہ رمضان - ذی قعدہ ۱۲۱۳ھ / ۱۷۹۹ء کا ذکر ہے۔

حج (۱۲۱۴ھ) اسی سال سعود بن عبدالعزیز پہلی مرتبہ حج سے مشرف ہوا۔ اہلِ نجد جنوب الاحساء اور بدوؤں کی ایک بڑی تعداد وہ اپنے ساتھ لے گیا تھا۔ یہ حج بہت شاندار طریقہ پر ادا ہوا۔ نہایت اچھی طرح عمرہ ادا کیا اور حج سے فارغ ہوئے کوئی تکلیف نہیں پہنچی

---

[1] عنوان:

[2] خلاصۃ الکلام: ص ۲۶۸۔

اور امن و امان سے واپس آئے۔ وللہ الحمد و المنۃ[1] اور ۱۲۱۴ھ میں سعود بن عبدالعزیز نے حج کیا۔ اس کے ساتھ بے شمار آدمی تھے (قومٌ کالرّمال)، مولانا شریف اور وہ ایک خیمہ میں ملے۔ جو ان کے لیے ابطح میں نصب کیا گیا تھا۔ ۲۸ ذی الحجہ، مئی ۱۸۰۰ء کو واپس ہوا۔[2]

حج (۱۲۱۵ھ) اس سال عبدالعزیز بن محمد بن سعود نے خود زیارت بیت اللہ کا قصد کیا تھا، اہل نجد و اطراف نجد کی بڑی تعداد لے کر وہ روانہ ہوئے لیکن سات دن برابر سفر کے بعد وہ چُور ہو گئے اور سعود بن عبدالعزیز کے اصرار پر وہ لوٹ گئے اور امیر سعود بن عبدالعزیز نے تزک و احتشام کے ساتھ حج کیا۔ ہزاروں صدقات اور بخشش کے طور پر تقسیم کیے۔ یہ ان کا دوسرا حج تھا۔[3] ان دونوں سالوں میں حج کے قافلے نجد کے حدود سے ہو کر امن و امان سے گزرے۔ خود سعود بن عبدالعزیز نے بہ نفس نفیس نگرانی کی، دوسرے سال عمان کا فرمانروا بھی حج سے مشرف ہوا۔[4]

۱۲۱۲ھ سے ۱۲۱۵ھ تک واقعات اور حج کی یہ ترتیب مستند ماخذ سے لی گئی ہے۔ امیر شکیب کے بیان[5] میں غالباً کسی یورپی ماخذ پر اعتماد کے باعث ترتیب الجھ گئی ہے اور صلح و حج کے سنین کا پتہ نہیں چلتا۔ اسی طرح ماروتمان کے مقالے[6] میں گو سنین ٹھیک ہیں لیکن ترتیب الٹی پلٹی ہے۔

کربلا پر (۱۲۱۶ھ / ۱۸۰۲ء) نجدیوں کے حملۂ کربلا و نجف اور بلد الحسین کی بے حرمتی کی داستان بہت کچھ رنگ آمیزی کے ساتھ بیان کی گئی ہے۔

---

[1] عنوان المجد: ۱، ۱۳۰۔ [2] خلاصۃ الکلام: ص ۲۱۸۔ [3] عنوان: ۱، ۱۲۱۔

[4] فلبی: ص: ۸۱۔ [5] حاضر العالم الاسلامی: ۴، ۱۶۳۔ ۱۶۲۔ [6] مقالہ ابن مسعود مندرجہ انسائیکلوپیڈیا آف اسلام۔

ہم یہاں صحیح ترین واقعات مختصر طور پر درج کرتے ہیں :-

"حجاج کے قافلوں پر واپسی میں عراق کے قبیلوں نے حملہ کیا، جنہیں یقینی طور سے اوپر سے اس کی ہدایت تھی تاکہ وہابیوں کے قافلہ کے انتظام اور ان کی ذمہ داری پر حرف لگایا جا سکے لیکن وہابیوں کے تعلقات بغداد اور اشراف کے ساتھ زیادہ دنوں تک دوستانہ نہ رہ سکے۔ سعود بن عبدالعزیز نے شہر کربلا پر ۱۸ ذی الحجہ ۱۲۱۶ھ (۲۱ اپریل ۱۸۰۲ء) کو حملہ کیا، تاکہ شیعی قبیلہ خزاعل کے وہابی قافلہ پر حملہ کا انتقام لیا جا سکے[1] ...." (مارو تمان)

اور اس سال (۱۲۱۶ھ) سعود تمام نجد، جنوب، حجاز اور تہامہ سے ایک جرار لشکر لے کر کربلا کے ارادہ سے چلا اور بلد الحسین کے باشندوں پر حملہ کیا۔ یہ ذی القعدہ کا واقعہ ہے[2] مسلمانوں نے اس پر دھاوا بول دیا۔ اس کی دیواروں پر چڑھ گئے اور زبردستی (عنوۃً) داخل ہو گئے اور اکثر باشندوں کو گھروں اور بازاروں میں تہ تیغ کر دیا اور اس قبہ کو جو ان کے اعتقاد کے مطابق حسین (رضی اللہ عنہ) کی قبر پر بنایا گیا تھا منہدم کر دیا۔ قبہ اور اس کے آس پاس اور چڑھاوے (النصیبۃ التی وضعوھا علی القبر) کی تمام چیزیں لے لیں۔ قبہ، زمرد، یاقوت اور جواہرات سے آراستہ تھا اور اس کے علاوہ شہر میں جو کچھ مال و متاع (ہتھیار، لباس، سونا، چاندی، قیمتی مصاحف اور بے شمار چیزیں)

---

[1] فلبی: ص ۸۱ : مارو تمان کا مقالہ

[2] ذی القعدہ ۱۲۱۶ھ (مارچ ۱۸۰۲ء) غالباً روانگی کی تاریخ ہے۔ اصل میں وفیھا سار سعود بالجیوش، وذلك فی ذی القعدۃ ہے۔ مارو تمان نے حملہ کی صحیح تاریخ ۱۸ ذی الحجہ ۱۲۱۶ھ (۲۱ اپریل ۱۸۰۲ء) دی ہے، جو صحیح معلوم ہوتی ہے۔

> ملا سب لے لیا اور شہر میں ایک پہر سے زیادہ نہیں ٹھہرے۔ ا ولم یلبثوا فیہا الا ضحوۃ“) اور ظہر کے وقت تمام مال لے کر وہاں سے نکل آئے اور اس کے باشندوں میں سے تقریباً دو ہزار آدمی قتل کیے گئے[1]۔“

اس واقعہ سے اہلِ نجد کی کتنی ہی تسکین کیوں نہ ہوئی ہو، لیکن عام مسلمانوں خاص کر ایران کے شیعوں میں اس سے بڑی برہمی پھیلی۔ کہا جاتا ہے کہ فتح علی شاہ قاچار (سنہ ۱۲۱۲ھ ۱۷۹۸ء تا سنہ ۱۲۵۰ھ ۱۸۳۴ء) نے ایک لاکھ فوج کے ساتھ نجد پر فوج کشی کرنا چاہی تھی اور سلیمان پاشا، حاکم بغداد بھی ایک بڑی فوج تیار کر رہا تھا لیکن اہل ایران کی روس سے چھڑ گئی اور سلیمان، کردوں کی ایک بغاوت فرو کرنے میں الجھ گیا اس لیے ان کے ارادے پورے نہ ہو سکے[2]۔

فتح علی شاہ قاچار، شاہ ایران کی برہمی تو بالکل قرین قیاس ہے لیکن نجد پر فوج کشی کے ارادہ کی تصدیق دوسری تاریخوں سے نہیں ہوتی۔ مشرقی کتاب خانہ، پٹنہ کے ایک مخطوطہ[3] سے اس پر کچھ روشنی پڑتی ہے۔ اس میں سعود بن عبد العزیز کی طرف سے فارسی میں فتح علی شاہ قاچار کے نام ایک خط ہے، جس میں باشندگان نجف کے مشرکانہ اعمال کی برائی کے ساتھ ساتھ ان کے قتل کا بھی ذکر ہے۔ نیز یہ بھی لکھا گیا ہے کہ اگر فتح علی شاہ نے ان برائیوں کے قلع قمع کرنے کی کوشش نہ کی تو امیر نجد کو مجبوراً سخت کارروائی کرنا پڑے گی۔ اس خط کے ساتھ فتح علی شاہ کا جواب بھی ہے، جس میں شاہ قاچار نے امیر نجد کو تنبیہ اور ان ”مظالم“ سے باز رہنے کی تاکید کی ہے، خط سے پہلے مختصر الفاظ میں شیخ الاسلامؒ کی دعوت کی تشریح (افادات) ہے۔ یہ افادات، سعود بن عبد العزیز کی طرف سے ہیں اور اصل مکتوب امیر عبد العزیز بن محمد بن سعود کی طرف سے لکھا گیا ہے۔ حملہ کربلا کے وقت امیر عبد العزیز حکمران تھا اور سعود بن

---

[1] عنوان المجد: ۱، ۱۲۲ - ۱۲۱

[2] حاضر العالم الاسلامی: ۴، ۱۶۳۔

[3] فہرست مشروح انگریزی CATALO UE RAISONNE : ۱۴ - ۱۳۳۷ء

عبدالعزیز ولی عہد اور سپہ سالار۔ اس لیے دونوں کا نام ہونا قرین قیاس بھی ہے۔

یہ مختصر مخطوطہ ۱۲۱۹ھ/۱۸۰۴ء کا لکھا ہوا ہے، یعنی واقعہ کے صرف تین سال بعد اس کی کتابت ہوئی ہے۔ خطوط پر تاریخ درج نہیں، بہرحال وہ حملۂ کربلا سے متصل ہی لکھے گئے ہیں اور اس میں فتح علی شاہ کے مجوزہ حملہ کا کوئی ذکر نہیں۔ پھر ہمیں فلبی کے بیان[1] سے یہ بھی معلوم ہے کہ ۱۸۰۸ء میں فتح علی شاہ اور سعود بن عبدالعزیز کے تعلقات اچھے اور دوستانہ تھے۔ اس لیے ہم شاہ ایران کے مجوزہ حملہ نجد کے متعلق وثوق کے ساتھ کچھ نہیں کہہ سکتے۔

رہا سلیمان پاشا حاکم عراق کا مسئلہ، سو اس کے بارے میں اتنا معلوم ہے کہ ۱۲۱۷ھ میں یعنی حملہ کربلا کے کچھ ہی بعد اس کا انتقال ہوگیا[2]۔

صلح کا خاتمہ (۱۲۱۷ھ)

واقعہ خرمہ کے بعد جو صلح فریقین کے درمیان ہوئی تھی، وہ بھی زیادہ دنوں تک قائم نہ رہ سکی۔ شریف غالب کو نجدی فوجوں کی زیادتی اور معاہدے کی خلاف ورزی کی شکایت ہوئی۔ خطوط سے مسئلہ طے نہ ہوا تو شریف نے اپنے وزیر عثمان مضایقی کو گفت و شنید کے لیے بھیجا، لیکن وہ وہاں جاکر ان کے حلقہ میں داخل ہوگیا اور واپسی پر اپنے نئے حلیفوں کی طرف سے غالب کو دعوت مبارزت دی۔

ادھر غالب اور اس کے بھائی عبدالمعین میں ان بن ہوگئی۔

عبدالمعین نے سعود سے مدد طلب کی۔ طائف کے قریب ایک جھڑپ ہوئی۔ پھر غالب طائف میں قلعہ بند ہوگیا، لیکن اسے زک اٹھانا پڑی اور طائف پر سعودی فوج کا قبضہ ہوگیا اور عثمان مضایقی حجاز کا حاکم مقرر ہوا[3] اور نجدی فوجیں اطراف و نواح میں پھیل گئیں، اب ان کا رخ

---

[1] ARABIA : صفحہ ۹۰ [2] عنوان المجد : ۱۲۲،۱

[3] اواخر ۱۳۱۷ھ، ۱۸۰۳ء۔

مکہ مکرمہ کی طرف تھا۔

حج کا موسم قریب آ رہا تھا، شامی قافلہ عبد اللہ پاشا کی سرکردگی میں حرم سے صرف تین دن کے فاصلہ پر آ کر رکا، سعود سے صلح ہو گئی۔ شرط یہ ہوئی کہ قافلہ تین دن میں مراسم حج سے فارغ ہو کر الٹے پاؤں واپس چلا جائے۔ غالب نے عبد اللہ پاشا سے درمیان میں پڑنے کی درخواست کی، لیکن وہ شرط کے مطابق حج سے فارغ ہوتے ہی واپس ہو گیا اور غالب کی التجا بیکار ہو گئی۔[1]

مکہ مکرمہ کا فاتحانہ داخلہ محرم ۱۲۱۸ھ (اپریل ۱۸۰۳ء)

حج کے ختم ہوتے ہی غالب نے جدہ جا کر پناہ لی اور سعود بن عبد العزیز یوم شنبہ ۸ محرم الحرام (۳۰[2] اپریل ۱۸۰۳ء) کو ایک فاتح کی حیثیت سے مکہ مکرمہ داخل ہوا۔ باشندوں کی طرف سے کوئی مزاحمت نہیں کی گئی۔ امیر سعود بن عبد العزیز غالب کے بھائی عبد المعین کو مکہ مکرمہ کا امیر مقرر کیا اور خود "اصلاح" کی طرف توجہ کی۔

"...... سعود نے باشندوں کو امان دی اور صدقات و عطیات دل کھول کر تقسیم کیے۔ جب سعود اور مسلمان، طواف اور سعی سے فارغ ہوئے تو اہل نواحی، قبوں اور شرکیہ مشاہد کے انہدام پر مامور کیے گئے۔

"مکہ کے ہر حصہ میں اس قسم کی چیزیں بہ کثرت تھیں سعود نے کوئی بیس دن قیام کیا اور اس دوران میں مسلمان ان قبوں کو گراتے رہے۔ تاآنکہ مکہ کے تمام "مشاہد" اور "قبے" زمین کے برابر کر دیئے گئے۔[3]

---

[1] عنوان: ۱، ۱۲۲/۱۲۱۔ [2] فلبی: ۸۳

[2] ڈکشنری آف اسلام (ص - ۶۶) میں داخلہ مکہ کی تاریخ ۲۷ اپریل دی گئی ہے، جو غلط ہے۔ غالباً زویمر (ص ۱۹۴) نے بھی اسی سے یہ غلطی نقل کی ہے۔ [3] عنوان: ۱، ۱۲۲/۳۲۲۔

سعود، عبدالمعین کو امیر بنا کر خود حرم کو مشرکانہ آلودگیوں سے پاک کرنے کی طرف متوجہ ہو گیا، کعبہ کے جواہر اور قیمتی ذخیرے فاتحین میں تقسیم کر دیئے گئے قبے گرائے گئے اور بعض مجاور قتل بھی کیے گئے۔[1]

ابن بشر جواہرات کی تقسیم اور مجاوروں کے قتل کا بالکل ذکر نہیں کرتا۔

یہ سعود کے داخلۂ مکہ کا ایک رخ تھا، جو شاید عام لوگوں کے نزدیک مقبول نہ ہو اس "فتح" کا دوسرا رُخ بھی ملاحظہ ہو۔ ایک پادری (HUGHES) کا بیان ہے :-

حرم کی تقدیس کے باعث باشندوں کو ادنیٰ گزند نہیں پہنچا اور اہل نجد کے صاحب امر ہونے کے بعد مسجدیں اس طرح آباد ہوئیں کہ بلد امین میں طاعت و زہد کی یہ مثال عہد نبوت کے بعد دیکھنے میں نہیں آئی تھی۔[2]

ایک اور یورپی معاصر (برک ہارٹ) لکھتا ہے :-

مقدس شہر میں داخل ہونے پر فوج نے کوئی ناروا حرکت نہیں کی تمام دکانیں دوسرے روز کھل گئیں اور فوجیوں نے ضرورت کی تمام چیزیں نقد قیمت دے کر خریدکیں۔[3]

ایک دوسری جگہ یہی برک ہارٹ لکھتا ہے :-

"اہل مکہ اب تک سعود کا نام جذبۂ امتنان کے ساتھ لیتے ہیں۔ مختلف زیادتوں اور حج کے موقعوں پر فوج کا قابلِ تعریف رویہ خاص طور پر یاد کیا جاتا ہے، بلدالحرام میں پہلے داخلے کے وقت اس کی سپاہ کا منصفانہ برتاؤ

---

[1] فلبی : ۸۳،

[2] ڈکشنری آف اسلام : ص ۶۶۰ - [3] NOTES ON BEDOUINS ETC : ج ۲

ص ۱۹۵ - نیز BRYDGE کی کتاب A BRIEF HISTORY OF THE WAHHABY

اب تک ان کے ذہن سے محو نہیں ہوا[1]۔"

اس کے علاوہ نماز با جماعت کی پابندی پر مجبور کیا گیا اور ریشمی کپڑے اور تمباکو کے آلات ضائع کر دیئے گئے غیر اسلامی ٹیکس اور چنگیاں روک دی گئیں[2]۔ مکرر جماعتیں بھی روک دی گئیں اور مختلف فقہی مذاہب کے علماء مختلف وقتوں میں امامت کرنے لگے[3]۔

اہل نجد کے عقائد اور طریق عمل کی توضیح کے لیے شیخ عبد اللہ بن شیخ الاسلامؒ کے قلم سے لکھوا کر ایک رسالہ عام طور پر تقسیم کیا گیا[4]۔ اس رسالہ میں قبوں اور زاویوں کے انہدام کا صاف صاف ذکر کیا گیا ہے نیز دوسرے مختلف فیہ مسئلوں پر گفتگو کی گئی۔ وحلان[5] کے بیان کے مطابق شیخ الاسلامؒ کے رسالہ "کشف الشبہات" کے پڑھنے پڑھانے کا بھی حکم ہوا۔

ابھی غالب کے جدہ میں پناہ لینے کا ذکر آچکا ہے، مکہ مکرمہ میں صرف چودہ دن قیام کے بعد سعود نے اس کا تعاقب کیا (۲۲ محرم ۱۲۱۸ھ) لیکن حملہ میں ناکام رہا، اس کی سپاہ پلیگ کا شکار ہو گئی۔ مجبوراً اسے سردست حجاز کا خیال چھوڑنا پڑا۔ مکہ میں اس کے دو سو آدمی رہ گئے تھے جو بری طرح ذبح کیے گئے[6]۔

امیر عبد العزیز کی شہادت (رجب ۱۲۱۸ھ)

۱۸ رجب ۱۲۱۸ھ (۴ نومبر ۱۸۰۳ء) کو امیر عبد العزیز بن محمد بن سعود حسب معمول درعیہ میں عصر کی نماز پڑھ رہا تھا کہ عین سجدہ کی حالت میں ایک جفاکار نے اسے خنجر سے شہید کر دیا۔ خیال کیا جاتا ہے کہ قاتل کوئی ایرانی یا کردی[7]

---

[1] ج ۲: ص ۱۴۹۔ [2] الهدية السنية ص ۴۳۔ [3] خلاصة الاحكام، ص ۲۷۸۔

[4] الهدية السنية: ص ۴۵-۱۴۔ [5] خلاصة الالكلام ص ۲۷۹

[6] حاضر العالم الاسلامی: ۴، ۱۶۲، فلبی: ص ۸۳۔ [7] عام مورخ قاتل کو ایرانی شیعہ بتاتے ہیں (فلبی: ۸۴، حاضر: ۴، ۱۶۳) لیکن ابن بشر (۱۲۳) کردی بتاتا ہے اور "قیل" کے ساتھ شیعی بھی کہتا ہے۔ یہ "قیل" اس لیے کہ کرد شیعہ نہیں بلکہ کٹر سنی ہیں (..... واللہ اعلم لان الاکراد لیسوا

شیعہ تھا، جس کے کئی لڑکے کربلا میں نجدیوں کے ہاتھوں قتل ہوئے تھے اور وہ انتقام کے ارادہ سے درعیہ میں قیام پذیر تھا۔ غریب صورت اور درویش منش پا کر امیر عبدالعزیز نے اس کی کافی خاطر و مدارات بھی کی۔ ایک سال انتظار کے بعد آخر اسے موقع ملا اور امیر عبدالعزیز کا کام کر کے اس نے اپنے دل کی بھڑاس نکالی۔

عبدالعزیز بن محمد بن سعود نے ۱۱۷۹ھ/۱۷۶۵ء سے ۱۲۱۸ھ/۱۸۰۳ء تک کل انتالیس سال حکومت کی اور اس حکومت کا بیشتر حصہ خود شیخ الاسلامؒ کی نگرانی میں گزرا۔ (۱۲۰۶ھ/۱۷۹۲ء) تک عبدالعزیز نے نمایاں حیثیت تو اپنے والد ہی کے عہد میں حاصل کر لی تھی اور تمام اہم معرکے (۱۱۵۹ھ سے ۱۱۷۹ھ/۱۷۶۵ء) اسی کی قیادت میں سر ہوئے تھے۔ بالکل اسی طرح جیسے اس کے دورِ حکومت میں تمام اہم لڑائیاں اس کے ولی عہد سعود بن عبدالعزیز کی سرکردگی میں لڑی گئیں۔ امیر عبدالعزیز نے خود شیخ الاسلامؒ کی صحبت اٹھائی تھی اس لیے تبلیغ و دعوت کا شوق اس کے دل و دماغ میں سمایا ہوا تھا۔ جو علاقہ فتح ہوتا، وہاں سب سے پہلے مبلغین اور مطوعین کا تقرر کرتا۔ رعایا پر رحم دلی اس کی خمیر میں داخل تھی۔ یہ موقع تفصیل کا نہیں، اس کے محاسن و معمولات ابن بشر نے اچھی طرح بیان کیے ہیں، ہم صرف قاضی محمد بن علی شوکانیؒ (۱۱۷۳ھ/۱۷۶۰ء - ۱۲۵۰ھ/۱۸۳۲ء) کی شہادت پر اکتفا کرتے ہیں۔ شوکانیؒ، امیر عبدالعزیز کے معاصر تھے اور ان پر شیخ الاسلامؒ[2] کی ہم مشربی کا "الزام" بھی نہیں عائد کیا جا سکتا:-

"جو اس کی حکومت میں داخل ہوتا، نماز، زکوٰۃ، روزہ اور تمام شعائرِ اسلام کا پابند ہو جاتا۔ اس کے حلقۂ طاعت میں شام ...... کے عرب داخل

(بقیہ حاشیہ ص ۷۹) باہل رفض ولا فی قلوبھم غلّ علی المسلمین: ۱، ۱۲۴) ابن بشر اس قاتل کا نام عثمان بتاتا ہے، جو موصل کے پاس ایک قصبہ عماریہ کا رہنے والا تھا۔

[1] ۱، ۱۲۸ - ۱۲۴۔ [2] ملاحظہ ہو: باب چہارم - "دعوت" اور باب پنجم "غلط بیانیاں"۔

ہوئے اور فرائض دین کے سخت پابند ہو گئے، حالانکہ اس سے پہلے وہ اسلام کے متعلق کچھ نہیں جانتے تھے اور غلط سلط کلمہ شہادت ادا کرنے کے سوا کوئی رکن ادا نہیں کرتے تھے۔ خلاصہ یہ کہ اس سے پہلے وہ بالکل جہالت میں گھرے ہوئے تھے اور اب نمازیں وقت پر ادا کرنے لگے ہیں[1]۔

برک ہارٹ[2] نے بھی اس کی تبلیغی کوششوں، قاضیوں کا تقرر، قاضیوں کی انصاف پرستی وغیرہ کا شاندار الفاظ میں ذکر کیا ہے۔

سعود بن عبد العزیز ۱۲۱۸ھ / ۱۸۰۳ء - ۱۲۲۹ھ / ۱۸۱۴ء

امیر عبد العزیز کی شہادت کے بعد اس کا بیٹا سعود امیر مقرر ہوا۔ سعود کے لیے امارت کی بیعت شیخ الاسلام کی زندگی ہی میں ان کے ایما سے لی جا چکی تھی[3]۔

سعود زمام حکومت ہاتھ میں لیتے ہی اپنے باپ کے نقش قدم پر دعوت و حکومت کی توسیع میں سرگرم ہو گیا اور دور دراز کے فوجی مہمات کی سرکردگی اپنے بیٹے عبد اللہ کے سپرد کی۔ عبد اللہ نے ایک طرف حجاز میں خیبر کو سرنگوں کیا اور دوسری طرف بحرین، عمان اور راس الخیمہ تک اپنی فتوحات کی دھاک بٹھا دی۔

اب باب عالی کو بھی فکر دامن [illegible]۔ علی پاشا حاکم عراق، عبد اللہ پاشا حاکم دمشق اور شریف پاشا، حاکم جدہ، تینوں کو اس خطرہ کی بیخ کنی کا حکم ہوا۔ عراق میں عربوں اور کردوں کی ایک بڑی فوج تیار کی گئی، لیکن یہ تیاریاں وقت پر مکمل نہ ہوئیں۔ ادھر سعود کو موقع ملا اور اس نے بصرہ پر دھاوا کر دیا۔ علی پاشا، حلہ میں قلعہ بند تھا۔ اسے چھوڑ کر نجدی فوجیں زبیر پر حملہ آور

---

[1] البدر الطالع ۲، ۵۔ [2] ص ۲۶

[3] ۱۲۰۲ھ / ۱۷۸۹ء۔ روضۃ الافکار: ۲، ۱۵۴۔ عنوان المجد: ۱، ۹۳۔

ہوئیں اور وہاں کے تمام قبے اور غیر شرعی مشاہد گرا کر واپس ہوئیں[1]۔ سعود تو کامیاب لوٹا اور علی پاشا کردستان کی ایک بغاوت فرو کرنے میں الجھ گیا اور اس کی مہم ناکام رہی[2]۔

مکہ مکرمہ کی دوبارہ فتح ۱۲۲۰ھ / ۱۸۰۶ء

اب سعود کو ہر طرف سے اطمینان ہو گیا تھا اور ساحلی علاقے اس کی برتری اور اقتدار تسلیم ہی کر چکے تھے۔ عراق کی طرف سے جو اطمینان ہوا، تو اس نے پھر حجاز کو زیر نگیں کرنے کا تہیہ کیا[3]۔ عثمان مضایفی نے بلا پس و پیش طائف پر قبضہ کر لیا اور ۱۲۲۰ھ / ۱۸۰۵ء کے آغاز میں اہلِ مدینہ نے بھی اطاعت قبول کر لی اور سمع و طاعت کا عہد کیا۔ حسبِ دستور مدینہ منورہ میں عام قبروں کے قبے اور زیارت گاہیں منہدم کر دی گئیں[4]۔

اس اثنا میں نجدی فوجیں، جو آس پاس کے تمام علاقوں پر قابض ہو چکی تھیں، مکہ مکرمہ کی طرف روانہ ہوئیں۔ حج کا زمانہ قریب آ گیا تھا، شامی قافلہ محاصرہ کی وجہ سے رک گیا۔ ادھر اہل مکہ پریشان ہوئے۔ مجبوراً غالب نے امان طلب کی اور سعود کی اطاعت کا عہد کیا[5]۔ شامی قافلہ کو حج کی اجازت ملی، غالب نے اطاعت کے ثبوت میں سعود کے پاس تحفے بھیجے اور اس نے اپنے سرداروں عبدالوہاب ابو نقطہ اور عثمان مضایفی کے منظور کردہ صلح کی تصدیق کی۔ پھر کیا تھا امن و خوشحالی کا دور دورہ ہوا، قحط سالی ختم ہوئی اور تمام راستے پُر امن ہو گئے[6]۔

---

[1] ذی الحجہ ۱۲۱۸ھ / مارچ۔ اپریل ۱۸۰۴ء

[2] عنوان: ۱، ۱۳۰۔ فلبی: ۸۷-۸۶

[3] ذی قعدہ ۱۲۱۹ھ / فروری ۱۸۰۵ء۔ [4] عنوان: ۱، ۱۳۵

اسٹاڈرڈ (دی نیو ورلڈ آف اسلام: صفحہ) اور HUGHES (ڈکشنری آف اسلام: ص ۶۶۰) وغیرہ نے قبۃ الرسول کے انہدام کا ذکر کیا ہے جو یکسر غلط ہے۔ (تفصیل غلط بیانیوں کے باب میں)۔ [5] اواخر ۱۲۲۰ھ / جنوری یا فروری ۱۸۰۶ء

[6] عنوان المجد: ۱، ۱۳۳-۱۳۴۔ یہ قحط سالی ذی الحجہ ۱۲۱۹ھ سے ذی قعدہ ۱۲۲۰ھ تک رہی۔

دو یورپی محقق (برک ہارٹ اور براج) جو ان واقعات کے تقریب عینی شاہد ہیں، ان سب سے الگ واقعہ کی نئی صورت پیش کرتے ہیں:-

"مدینہ منورہ ۱۸۰۴ء میں فتح ہوا۔ وہاں ایک شخص حسن قلعی شہر پر قابض ہو گیا تھا اور شہر کو سعود کے سپرد کرنے سے پہلے، قبہ شریف کے خزانہ پر قبضہ کر کے اس نے اپنے خاص لوگوں میں تقسیم کر دیا۔ فتح کے کچھ ہی بعد سعود (مدینہ) پہنچا اور قبہ کھول کر، جو تھوڑا بہت بچ گیا تھا اسے اپنے قبضہ میں کر لیا۔[1]

سعود کا تیسرا حج ۱۲۲۱ھ ۱۸۰۷ء

سعود کے دو[2] حج پہلے مذکور ہو چکے ہیں۔ اب دوبارہ فتح مکہ کے بعد پھر اسے زیارت بیت اللہ اور اپنی تبلیغی کوششوں کی تکمیل کا موقع ملا۔

تیسرے حج کا ارادہ کر کے وہ ۱۲، ذی قعدہ ۱۲۲۱ھ (۲۱ جنوری ۱۸۰۷ء) کو درعیہ سے روانہ ہوا، مکہ مکرمہ پہنچ کر اس نے اپنی حیثیت اور منصب کے مطابق صدقات و عطیات تقسیم کیے۔ ذی الحجہ کے آخر میں مدینہ منورہ روانہ ہوا اور وہاں انتظامی امور ٹھیک کر کے لوٹ گیا۔ احمد دحلان حجرہ شریف کے زر و جواہر کے نکالنے کا ذکر کرتا ہے[3]، لیکن ابن بشر ساکت ہے

(بقیہ حاشیہ ص ۸۲) (خلاصۃ الکلام: ص ۲۰۵) نجد و یمن پر بھی اس قحط کا اثر پڑا، لیکن سب سے زیادہ تنگی مکہ مکرمہ میں محسوس ہوئی۔ جنگ اور محاصرہ کی وجہ سے باشندے یوں ہی چور تھے، قحط نے بالکل ادھ موا کر دیا۔ فلبی نے فتح مکہ کے ساتھ سلب و نہب کا بھی ذکر کیا ہے، حالانکہ یہ بالکل غلط ہے۔ احمد زینی دحلان نے حسب عادت "وہابیوں" کو بے شمار گالیاں دی ہیں، لیکن اس قتل و نہب کا بالکل ذکر نہیں کیا (خلاصۃ الکلام ص ۲۹۲)

[1] برک ہارٹ: ۲،۹۰۔ ۱۹۸۔ براج: ص ۳۳۔ ۳۴۔

[2] ۱۲۱۴ھ اور ۱۲۱۵ھ

[3] خلاصۃ الکلام: ص ۲۹۴

بلنٹ[1] اور دوسرے یورپی مورخ بھی اس کا ذکر کرتے ہیں لیکن ابن بشر کے سکوت کی وجہ سے ہم کچھ نہیں کہہ سکتے۔ اگر نجف کی طرح حجرہ نبویہ کے زر و جواہر بھی سعود تصرف میں لاتا یا سپاہیوں میں تقسیم کرتا تو یہ نجدی معاصر ضرور ذکر کرتا۔ اس لیے کہ اس کے نزدیک یہ کوئی مذموم تھا ہی نہیں۔ نجف و کربلا میں اس قسم کے واقعات، خود ابن بشر کی زبانی گزر چکے ہیں۔

البتہ جبرتی[2] خود عبداللہ بن سعود کی زبانی، زر و جواہر کے لینے اور پھر ان کی واپسی کا ذکر کرتا ہے۔ جس سے شبہ ہوتا ہے کہ شاید واقعہ صحیح ہو اور ابن بشر نے نظر انداز کر دیا ہو۔

اس سفر میں چند خاص باتیں ہوئیں۔ شامی قافلے کو شرطوں (باجے گاجے سے پرہیز وغیرہ) کی عدم تعمیل کے باعث واپس ہونا پڑا[3]۔ سعود نے ترک فوجوں کو مکہ مکرمہ چھوڑنے پر مجبور کیا اور غالب نے سعود کے ہاتھ پر بیعت کی[4]۔ اس حج میں سعود کے ساتھ اس کے تمام امراء اور اہل نجد و نواح نجد کی بڑی تعداد تھی۔

حج اور اصلاحات ۱۲۲۱ھ ۱۲۲۷ھ

۱۲۲۱ھ میں تیسرا حج ہوا اور اس کے بعد ۱۲۲۷ھ / ۱۸۱۲ء تک

اس نے ہر سال حج کیے۔ حج و اجتماع کے ان موقعوں پر وہ اپنی تبلیغی کوششوں سے کبھی غافل نہیں رہا۔ مختلف سالوں میں اس نے مختلف احکام نافذ کیے۔ مصری اور شامی محمل روک دیے گئے، نیز قافلوں کے ساتھ باجے گاجے کی یک لخت ممانعت کر دی[5]۔

"مکہ مکرمہ میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا بول بالا ہوا۔ بازاروں میں اب تمباکو پینے والا نظر نہیں آتا۔ سعود نے خاص طور پر نماز کے لیے محتسب

---

[1] A PILGRIMAGE TO NEJD ۲، ۲۵۶

[2] عجائب الآثار: ۴، ۲۹۹۔ [3] خلاصۃ الکلام: ص ۲۹۴

[4] عنوان: ۱، ۱۳۸۔ [5] خلاصۃ الکلام: ص ۲۹۴۔

مقرر کیے ۔ اذان ہوتے ہی بازاروں میں "الصلوۃ الصلوۃ" کی منادی ہوتی۔[1]

۱۲۲۷ھ/۱۸۱۱ء میں خود ابن بشر زیارت بیت اللہ سے مشرف ہوا، وہ اپنا ذاتی مشاہدہ بیان کرتا ہے :-

"میں نے بھی اس سال حج کیا۔ میں نے سعود کو احرام کی حالت میں ایک سواری (اونٹ) پر دیکھا۔ اس سواری پر کھڑے ہوکر اس نے ایک بلیغ خطبہ دیا۔ جس میں لوگوں کو نصیحت کی اور آداب حج بتائے اور انہیں کلمۃ لا الٰہ الا اللہ کی برکتیں (اتحاد، امن، دولت کی فراوانی اور سرکشوں کی اطاعت) یاد دلائیں۔ اس نے کہا کہ وہ ایک کمزور سے کمزور کو قوی سے قوی کے مقابلہ میں اس کا حق دلاکر رہے گا۔ اسی سواری پر سے اس نے منادی کی!

مکہ مکرمہ میں کوئی ہتھیار نہ اٹھائے اور کوئی عورت آراستہ و پیراستہ ہوکر نہ نکلے اور اس حکم کی خلاف ورزی کرنے والوں کو سزا کی دھمکی دی اور بازاروں میں نماز پر آمادہ کرنے کے لیے خاص آدمی مقرر کیے۔ اب تم نماز کے وقت شاید ہی کسی کو برگشتہ پاسکو اور ان تمام سالوں میں بازار میں کوئی تمباکو یا دوسری مسکرات کھلم کھلا استعمال کرنے کی جرأت نہ کرسکا۔"[2]

۱۲۲۶ھ/۱۸۱۲ء کے متعلق ابن بشر لکھتا ہے :-

"اور مکہ مکرمہ میں اب کوئی منکر چیز (تمباکو نوشی، ترک صلوٰۃ اور غیراللہ کی قسم کھانا) نہیں دکھائی پڑتی"۔

---

[1] ۱۲۲۳ھ/۱۸۰۹ء، عنوان: ۱: ۱۴۱۔

[2] عنوان: ۱: ۱۸۱۔

سعود بن عبد العزیز کی اصلاحات کا سب سے زیادہ مفصل ذکر جبرتی کرتا ہے۔ محرم ۱۲۲۱ھ کے حوادث میں شریف غالب اور امیر سعود کی باہمی مصالحت کا ذکر کرتا ہوا لکھتا ہے:

"منکرات کی گرم بازاری اس نے قطعاً روک دی۔ اسی طرح سعی اور صفا و مروہ کے درمیان تمباکو نوشی بھی بند کر دی۔ جماعت کے ساتھ نمازوں کی پابندی اور زکوٰۃ کی ادائیگی کا حکم دیا۔ ریشمی کپڑوں کے استعمال کی بھی ممانعت کی ناروا محصول اور عام مظالم روک دیئے گئے اور وہ لوگ (اہلِ مکہ اور شریف مکہ) اس بارے میں حد سے گزر چکے تھے اور وہ ہر لاش پر پانچ یا دس فرنک ٹیکس لیتے تھے اور اگر مردے کے اعزا مقررہ محصول نہ ادا کر سکتے تو انہیں لاش اٹھانے اور دفن کرنے کی اجازت نہ ملتی ..... اس کے علاوہ بے شمار بدعتیں اور نت نئے ناروا محصول انہوں نے ایجاد کر لیے تھے۔ بازار کی خریداری اور گھروں پر بھی محصول عائد ہوتا، بسا اوقات انسان اپنے گھر میں اطمینان سے بیٹھا ہوتا اور اسے یک بیک گھر خالی کرنے کا حکم ملتا۔ سرکاری ملازم کہتے کہ "آقا کو اس گھر کی ضرورت ہے، اب یا تو گھر خالی کر دو یا پھر کچھ لے دے کر مصالحت کر لو".......

"...... شریف نے ان سب چیزوں کے ترک کر دینے کا عہد کیا اور جیسا کہ اللہ تعالےٰ نے قرآن کریم میں حکم دیا ہے توحید، اتباع رسول اور خلفائے راشدین کے اسوہ کی پیروی کا عہد کیا اور ان تمام چیزوں سے احتراز کا وعدہ کیا، جو لوگوں نے بعد کو ایجاد کر لی ہیں۔ غیر اللہ سے مدد مانگنا قبروں پر قبوں کی تعمیر، تصویر دل اور غاسی چیزوں کی بہتات، چوکھٹوں کو بوسہ دینا، غیر اللہ کے لیے تذلل اور خضوع ـــــ خلاصہ یہ کہ ان تمام بدعتوں سے اجتناب کا اس نے عہد کیا جن میں کہ مخلوق کو کسی نہ کسی طرح الوہیت کا شریک گردانا جاتا ہے.......

ان اصلاحات کے بعد راستے مامون ہو گئے۔ مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ اور

جدہ اور طائف کے راستے کھل گئے......"[1]

برک ہارٹ[2] نے بھی نمازوں پر سختی اور سزاؤں کا ذکر کیا ہے۔

بعض دوسری فتوحات اور لڑائیاں

حجاز کی فتح پر سعود کی فوجی سرگرمیاں ختم نہیں ہوئیں۔ (۱۲۲۳ھ/۱۸۰۸ء) میں اس نے نجف پر حملہ کیا۔ لیکن کامیابی نہ ہوئی[3]۔ راستے میں سماوہ اور زبیر پر حملے کیے گئے۔

ربیع الآخر ۱۲۲۵ھ (جون ۱۸۱۰ء) میں سعود نے شام کا قصد کیا اور متعدد حملوں کے بعد کافی مال و متاع لے کر کامیاب لوٹا[4] اور ابن بشر کے بیان کے مطابق :-

"اس غزوہ کی وجہ سے اہلِ شام کے دلوں پر سعود کی دھاک بیٹھ گئی"۔

بصرہ اور اس کے نواح پر بار بار حملے ہوئے لیکن کوئی پائیدار فائدہ نہیں ہوا

راس الخیمہ ۱۲۲۴ھ

ان لڑائیوں کے علاوہ ایسٹ انڈیا کمپنی سے بھی ایک جھڑپ ہوئی۔ خلیج فارس کے باشندے جو قبیلہ جوازم سے تعلق رکھتے تھے، عرصہ سے تجارتی جہازوں پر دھاوے کیا کرتے اور کامیاب رہتے۔ اب سالہا سال سے عمان اور خلیج فارس کے ساحلی علاقوں پر سعود کا سکہ چلتا تھا اور یہ بحری سپاہی (قرطان PIRATES) بھی سعود ہی کے زیرِ نگیں تھے۔ انیسویں صدی کے شروع میں اس "بحری تاخت" کے روک تھام کی انگریزوں نے بڑی کوششیں کیں اور آخر حکومتِ بمبئی نے ستمبر ۱۸۰۹ء (رمضان ۱۲۲۴ھ) میں ان کے مرکز راس الخیمہ پر سخت حملہ کیا اور قرطان PIRATES کے بیڑہ کو ضرب لگائی[5]۔ ۱۲ر نومبر ۱۸۰۹ء (شوال ۱۲۲۴ھ) تک راس الخیمہ جلا کر راکھ کیا جا چکا تھا اور قرطان کو اپنا راس الخیمہ کا مرکز چھوڑنا پڑا۔

---

[1] عجائب الآثار : ۴ ، ۶ ۔ ۵ (ملخص) ، [2] ص ۱۴۷

[3] عنوان : ۱ ، ۳۵ ۔ [4] عنوان : ۱ ، ۱۴۹ ۔ ۱۴۸

[5] عنوان : ۱ ، ۱۴۶ : فلبی ص ۹۲

گو اس شکست سے نجدیوں کی مقامی ساکھ قائم رہی اور عمان کے اندرونی علاقوں میں ان کی عسکری تگ و تاز جاری رہی۔ پھر بھی زویمر کے الفاظ میں:-

"مصریوں سے پہلے اہلِ نجد کو جو سب سے سخت دھکا لگا وہ یہی برطانیہ کے ہاتھوں تھا۔ ۱۸۰۹ء میں بمبئی سے الگ ایک انگریزی مہم ان کے خاص بحری مستقر اور مرکز راس الخیمہ کے "قرصی باشندوں PIRATIC INHABITANTS کے خلاف پہنچی۔ مرکز پر بمباری کی گئی اور جلا کر خاکستر کر دیا گیا[1]۔ براکج[2] نے وہابیوں کی زیادتیوں اور راس الخیمہ پر حملہ اور پھر ان کی سزایابی کی مفصل روداد بیان کی ہے اور کرنل اسمتھ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ "وہابی کی طاقت پر یہ پہلی اخلاقی ضرب تھی"۔

مصریوں کا حملہ ١٣٢٦ھ / ١٨١١ء

اواخر ١٢٢٦ھ / ١٨١١ء میں مصریوں کا حملہ شروع ہوا۔ اس وقت نجدی حکومت کا اثر شمال میں حلب سے لے کر بحرِ ہند تک اور مشرق میں خلیج فارس اور عراق سے لے کر بحر قلزم تک پھیلا ہوا تھا اور راس الخیمہ کی زک کو چھوڑ کر اب تک اس جواں سال حکومت کو قابلِ ذکر صدمہ بھی نہیں پہنچا تھا۔ نجدی اثر و اقتدار کی خبریں آستانہ پہنچ رہی تھیں۔ بغداد اور دمشق اور جدہ کے حاکم عاجز آ چکے تھے۔ آخر بابِ عالی نے تنگ آ کر محمد علی پاشا خدیو مصر کو اہلِ نجد کی سرکوبی پر مامور کیا[3]۔ کہا جاتا ہے کہ یہ ۱۸۰۴ء میں اسی شرط پر مصر کا پاشا بنایا گیا تھا۔ "سانپ مرے اور لاٹھی نہ ٹوٹے"، شاید ایسے ہی موقع پر کہا گیا ہو۔ محمد علی[4] خدیو مصر کی روز افزوں طاقت بھی بابِ عالی

---

۱ ARABIA. THE CRADLE OF ISLAM - ۲ براگخ: ص ۴۴-۴۵: نیز برک ہارٹ: ص ۲۰۸

۳ ۱۲۲۶ھ / ۱۸۱۱ء - ۴ محمد علی پاشا مصر کے موجودہ شاہی خاندان کا مورثِ اعلیٰ تھا، غالباً یہ البانوی نسل کا تھا۔ گو اس کے جانشین ابراہیم پاشا کا یہ قول مشہور ہے کہ "عربی زبان و تمدن نے ہمیں "عرب" بنا دیا"۔ محمد علی کی ولادت ۱۱۸۲ھ / ۱۷۶۸ء میں اور وفات ۱۲۶۵ھ / ۱۸۴۹ء میں ہوئی۔

کے لیے مستقل خطرہ بنتی جا رہی تھی۔ آل سعود اور خدیو مصر دونوں کی ٹکر آستانہ کے عرش نشینوں کے لیے فائدے سے خالی نہیں تھی۔

محمد علی کا بیٹا طوسون (ف ۱۲۳۱ھ/۱۸۱۶ء) دس ہزار فوج لے کر ساحل پر اترا اور بآسانی ینبع پر قابض ہو گیا[۱]۔ اس کے بعد وہ مدینہ کی طرف بڑھا۔ راستے میں جدیدہ کی تنگ گزرگاہ کے قریب سعود کے بیٹوں عبد اللہ اور فیصل نے جم کر مقابلہ کیا اور شکست دی۔ تقریباً بارہ سو مصری مقتول ہوئے[۲]۔ اور طوسون کو پھر ینبع کی طرف ہٹنا پڑا[۳]۔

طوسون

طوسون کچھ دنوں ینبع پڑا رہا، پھر اس نے مدینہ کی طرف پیش قدمی کی اور اب کے دو ماہ کے محاصرے کے بعد مصری مدینہ منورہ پر قابض ہو گئے[۴]۔

طوسون فوراً جدہ پہنچا۔ عبد اللہ بن سعود، جو حجاز میں نجدی افواج کا سردار تھا۔ مکہ مکرمہ خالی کرنے پر مجبور ہوا اور بلد الحرام پر بلا کسی پس و پیش کے مصریوں کا قبضہ ہو گیا[۵]۔ کچھ ہی دنوں کے بعد طائف بھی ان کے قبضہ و اقتدار میں آگیا اور احمد دحلان کے بیان کے مطابق اس فتح کی خوشی میں تمام مصری قلمرو میں پانچ روز جشن منایا گیا۔ اس کے بعد طائف سے قریب تربہ کے قریب سخت معرکہ پیش آیا اور مصریوں کو شکست ہوئی[۶]۔

تربہ کے اس واقعہ کے بعد سعود کے گورنر عثمان مضایفی کی ہمت بڑھی اور پھر اس نے

---

۱ برک ہارٹ: ص ۲۳۲۔ ۲ اواخر ذی قعدہ ۱۲۲۶ھ/ دسمبر ۱۸۱۱ء۔ بارد تمان نے مصریوں کی شکست کی تاریخ ۷/ ذی قعدہ ۱۲۲۶ھ/ ۲۳ نومبر ۱۸۱۱ء دی ہے۔ برک ہارٹ (ص ۲۲۹) اور برائج (ص ۵۱) نے پیش قدمی کی تاریخ جنوری ۱۸۱۲ء لکھی ہے۔

۳ ذی قعدہ ۱۲۲۷ھ/ نومبر ۱۸۱۲ء، عنوان: ۱، ۱۵۸، فلبی: ص ۹۴۔

۴ محرم ۱۲۲۸ھ/ جنوری ۱۸۱۳ء۔ عنوان: ص ۱۶۰

۵ خلاصۃ الکلام: ص ۲۹۶

۶ شعبان ۱۲۲۸ھ/ اگست ۱۸۱۳ء، عنوان: ص ۱۶۱

طائف کی طرف پیش قدمی کی لیکن اب کے اسے زک ہوئی۔ اس کے بہت سے آدمی کام آئے آخر وہ خود گرفتار ہوا[1] اور غالب نے اسے محمد علی پاشا کی خدمت میں مصر بھیج دیا۔ محمد علی تو حجاز کے لیے رخت سفر باندھ چکا تھا، اس کی عدم موجودگی میں عثمان مضایفی کو ایک خچر پر بٹھا کر پورے قاہرہ میں گشت کرایا گیا اور اس کے بعد دار الحکومت (آستانہ) بھیج دیا گیا، جہاں موت اس کا انتظار کر رہی تھی[2]۔ احمد وحلان جس نے عثمان مضایفی کی برائی میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی[3]۔ اس بے رحمانہ قتل پر اظہار افسوس کرتا ہوا لکھتا ہے:-

"عثمان مضایفی جب مصر میں تھا تو محمد علی پاشا کے ارباب حکومت اس کی گفتگو اور فصیح زبان سے بہت متاثر ہوئے، اس کی متانت اور وقار کا ان پر بڑا اثر ہوا۔ اس کے چہرہ سے امارت اور شرافت کے آثار ظاہر تھے ...... یہاں تک کہ اکثر لوگ ایسے شریف آدمی کو آستانہ بھیجنے پر اظہار افسوس کرنے لگے۔ وہ جانتے تھے کہ دار السلطنت پہنچ کر اس کا بچنا ناممکن ہے[4]۔ الخ

جنگ اور فتح کی رفتار سے غیر مطمئن ہو کر خود محمد علی حجاز کے قصد سے روانہ ہو گیا[5] اور اواخر شوال میں اس نے جدہ میں قدم رکھا۔ اس نے آتے ہی پہلے شریف غالب کی امارت کا خاتمہ

---

[1] ۱۰ رمضان ۱۲۲۸ھ / ۶ اگست ۱۸۱۳ء۔ عنوان: ص ۱۶۲ - فلبی (ص ۹۶) نے عثمان مضایفی کی گرفتاری اور قتل کے واقعہ کو مؤخر کر دیا ہے، احمد وحلان (۲۹۶) اور ابن بشر (۱۶۲) دونوں اس واقعہ کو محمد علی پاشا کی آمد حجاز سے پہلے ذکر کرتے ہیں۔ برک ہارٹ (ص ۲۴۷) اور برائج (ص ۱۶) کا بیان ہے کہ عثمان مضایفی کی گرفتاری پر پانچ ہزار ڈالر انعام رکھا گیا تھا۔ یہ دونوں گرفتاری کی تاریخ ستمبر ۱۸۱۳ء بتاتے ہیں اور معرکہ بسل کے بعد جس کا ذکر ابھی آتا ہے۔

[2] اواخر ۱۲۲۸ھ / دسمبر ۱۸۱۳ء۔ [3] خلاصۃ الکلام: ص ۲۷۲-۲۷۱

[4] ایضاً: ص ۲۹۶ ملخص۔ [5] ۱۴ شوال ۱۲۲۸ھ / ۱۰ اکتوبر ۱۸۱۳ء؛ خلاصۃ: ص ۲۹۶

کیا۔ اسے گرفتار کرکے مصر اور وہاں سے سلونیکا بھیج دیا گیا جہاں غریب دو سال کے بعد وہاں آخرت کو سدھار گیے[1]۔ غالب کے بھتیجے یحیٰی بن سرور کو برائے نام امیر بنایا گیا اور تمام ملکی اختیارات حجاز کے لیے گورنر احمد پاشا کو دے دیئے گئے۔ حجاز کو بدنام وہابیوں کے پنجہ سے نکال کر مصر کا ایک صوبہ[2] بنا دیا گیا۔ اسی امارت کے پیچھے غالب نے کیا نہ کیا تھا؟

"وہ کبھی وہابیوں کے ساتھ چاپلوسی سے پیش آتا اور ان کے عقائد کی تائید کرتا، کبھی قبول کو گرانے کا حکم دیتا، کبھی مؤذنوں کو سلام (بعد الاذان) سے روکتا[4]"

یہ سب اس لیے کہ سعود کہیں اسے معزول نہ کر دے[5]۔ سعود کا مقصد نیک تھا۔ اس نے غالب کی امارت قائم رکھی۔ محمد علی خالص دنیا دار تھا اس نے قدم رکھتے ہی سب سے پہلے اسی غریب کا خاتمہ کیا۔ محمد علی نے جس عیاری کے ساتھ غالب کو گرفتار کیا ہے اسی کا حال "خلاصۃ الکلام" میں پڑھیے[6]۔ برانج[7] نے بھی غالب کی گرفتاری کی تفصیلات دی ہیں، جو "خلاصۃ الکلام" سے ملتی جلتی ہیں۔

---

[1] فلبی (ص ٦٥) نے ورود جدہ کی تاریخ ٢٨ راگست ١٨١٣ء دی ہے۔ اسی طرح ہاروتان نے اواخر اگست لکھا ہے۔ ابن بشر نے (ص ١٦٣) قدوم مکہ مکرمہ کی تاریخ صرف ذی قعدہ دی ہے۔ برک ہارٹ (ص ٢٨١) اور برانج (ص ٦٢) ستمبر ١٨١٣ء لکھتے ہیں۔ ہم نے یہاں "خلاصۃ الکلام" پر اعتماد کیا ہے۔ فلبی کی تاریخ واقعات کی ترتیب سے لگا نہیں کھاتی۔

[2] اواخر رمضان ١٢٣١ھ / جولائی ١٨١٦ء۔ عنوان: ص ١٥٥۔ الرحلۃ الحجازیہ: ص ٨٩، برک ہارٹ ص ٢٦٢

[3] حجاز اس کے بعد ایک عرصہ تک مصر کے تابع رہا۔ اسی دوران میں محمد علی اور باب عالی کے درمیان اَن بن ہوئی اور خونریز معرکے ہوئے۔ محمد علی کا بیٹا شام پر قابض ہوگیا اس کے بعد جب سلطان عبد المجید تخت نشین ہوا (١٢٥٥ھ) تو حجاز براہِ راست دولت علیہ کی حمایت میں آیا (خلاصۃ الکلام ص ٣٠٨)

[4] الرحلۃ الحجازیہ: ص ٨٩۔ [5] خلاصۃ الکلام: ص ٢٩٢۔ [6] اس عیاری کا خلاصہ یہ ہے کہ محمد علی نے دعوت کے بہانے سے گورنر ہاؤس میں بلایا۔ اس کے آدمی چھپے ہوئے تھے۔ بے چارے کو نہتا اور بے مددگار پاکر گرفتار کرلیا۔ بزدل حجازی سرپیٹ کر رہ گئے۔ [7] ص ٦٩-٦٨

غالب اور محمد علی کے باہمی نزاع پر بھی اس نے کافی روشنی ڈالی ہے[1]۔ غالب اور محمد علی کا ذکر کرتے ہوئے ایک دوسرے موقع پر وہ لکھتا ہے:

"یہ تو امید ہو ہی نہیں سکتی تھی کہ محمد علی اور غالب جیسے پرلے درجہ کے پختہ مکار SO ACCOMPLISHED IN DECEIT ایک دوسرے پر اعتماد کر سکیں گے[2]"

برک ہارٹ نے بھی محمد علی کی بدنیتی اور مکاری کی بار بار اور سخت شکایت کی ہے[3] لیکن وہ غالب کا مداح ہے۔ جب غالب قید ہو کر مصر پہنچا تو برک ہارٹ وہاں موجود تھا اور اس نے غالب کی ملاقات کے تاثرات قلمبند کیے ہیں[4]۔

لیکن ابھی محمد علی اور مصریوں کی حالت کوئی ایسی قابل اطمینان بھی نہیں تھی۔ حجاز، عسیر اور یمن کے ساحلی مقامات تو آسانی سے مصریوں کے قبضہ میں آ گئے لیکن اندرونی علاقے ابھی تک نجدیوں کے زیر اثر تھے۔

مصطفےٰ بے مقابلہ کے لیے بھیجا گیا، ترابہ کے مقام پر پھر جنگ ہوئی اور مصریوں کو شکست اٹھانی پڑی[5]۔ عجیب بات یہ ہے کہ نجدیوں نے یہ معرکہ ایک بہادر عورت غالیہ کی سرکردگی میں سر کیا تھا[6]۔ برک ہارٹ نے غالیہ کی بہادری کی توصیف میں زبان قلم کے خوب جوہر دکھائے ہیں۔

محرم ۱۲۲۹ھ (جنوری ۱۸۱۴ء) میں سمندر سے مصری کمک پہنچی اور قنفذہ کے قریب فریقین میں مڈبھیڑ ہوئی اور مصریوں کو شکست ہوئی[7]۔

---

[1] ص ۵۹۔ ۶۱۔ [2] ص ۴۷ [3] ص ۲۴۲۔ [4] ص ۲۶۲۔ ۲۵۹۔

[5] اواخر ذی الحجہ ۱۲۲۹ھ (دسمبر ۱۸۱۳ء)۔ عنوان: ص ۱۶۲۔ ۱۶۳

[6] برک ہارٹ: ص ۹۔ ۲۶۰، فلبی: ص ۹۶، دحلان: ص ۳۰۰۔ [7] عنوان: ص ۱۶۲

سعود کی وفات ۱۲۲۹ھ / ۱۸۱۴ء

ابھی نجدیوں اور مصریوں کی کشمکش اسی خطرناک مرحلہ سے گزر رہی تھی اور نجدی پھر از سر نو مقابلہ کی تیاریاں کر رہے تھے کہ برات کا دولھا چل بسا۔ امیر سعود بن عبد العزیز محمد بن سعود نے دوشنبہ ۱۱ جمادی الاولیٰ ۔ ۱۲۲۹ھ[1] (پہلی مئی ۱۸۱۴ء) کی شب کو دار آخرت کی راہ لی اور محمد علی پاشا کی مہم کے لیے راستہ صاف ہو گیا۔ اب نجد کی نئی حکومت کے پھولنے پھلنے کی توقع سرد ہوتی جاتی رہی۔

سیرت سعود

ان لڑائیوں سے الگ بھی، سعود ایک بے مثال امیر اور فرمانروا تھا، اس کی پیدائش ۱۱۶۰ھ یا ۱۱۶۳ھ میں ہوئی۔[2] شیخ الاسلام رح کے درس میں مسلسل کئی سال تک سعود نے حاضری دی اور حدیث و فقہ میں اچھی دستگاہ حاصل کی۔ اس کے خطبے اور مکتوبات زبان اور علم دونوں کی حلاوت رکھتے ہیں۔

لڑائیوں میں عام طور پر نماز مغرب کے بعد وعظ کہتا اور لوگوں کو صبر و طاعت کی تلقین کرتا نیز رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام رض کا اسوہ پیش کر کے انہیں بہادری اور ثابت قدمی پر آمادہ کیا کرتا۔

جنگوں میں انتہائی مخاصمت اور شدت کے باوجود بچوں، عورتوں، بوڑھوں پر ہاتھ نہیں اٹھایا جاتا۔ البتہ مال غنیمت میں رعایت نہیں ہوتی۔ لڑائی ختم ہوتے ہی "خمس" وضع کر کے مال غنیمت سپاہیوں میں تقسیم کر دیا جاتا۔ سپاہیوں میں بھی پیادہ اور سوار کا فرق قائم رکھا جاتا۔ راجل (پیادہ) کو فارس (سوار) کا نصف ملتا۔ خلاصہ یہ کہ جنگوں میں ٹھیٹھ اسلامی قانون پر عمل کرنے کی کوشش کی جاتی۔

یہ تو رزم کا حال تھا۔ بزم کی کیفیت کچھ اور ہوتی۔ اہل درعیہ نماز صبح کے بعد روزانہ

---

[1] عنوان المجد: ص ۱۷۶، مارو تھان ۸ جمادی الاولیٰ (۲۷ اپریل ۱۸۱۴ء) تاریخ وفات بتاتا ہے۔ جسے صحیح ماننے میں ہمیں تامل ہے۔

[2] البدر الطالع: ۱، ۲۶۳۔

کسی عام جگہ (قصر سے باہر) جمع ہوتے۔ امیر سعود اور آل سعود صدر نشین ہوتے۔ ان کے پہلو بہ پہلو شیخ الاسلام کے اہلِ خاندان ہوتے۔ جن کا کوئی فرد درس وعظ کی خدمت انجام دیتا۔ صبح کی مجلس میں عام طور پر عبداللہ بن شیخ الاسلامؒ درس دیتے۔ اکثر "تفسیر ابن جریر" اور "تفسیر ابن کثیر" کا سبق ہوتا۔ درس سے فارغ ہو کر وہ قصر میں جلوہ افروز ہوتا اور عام مخلوق کی ضروریات سنتا اور ان کی شکایات دور کرتا، درمیان میں قیلولہ کا وقفہ ہوتا اور ظہر کے بعد قصر کے اندر درس کی مجلس مرتب ہوتی لیکن اس وقت آل الشیخ نہ ہوتے، ظہر کے بعد ان میں سے ہر ایک کا حلقہ درس الگ الگ جمتا۔ اس سہ پہر کے درس میں خود امیر سعود معلم کی حیثیت سے دادِ علم دیتا۔ عام طور پر "تفسیر ابن کثیر" اور "ریاض الصالحین" کی قراءت ہوتی اور سعود تقریر و شرح کرتا۔ درس سے فارغ ہو کر پھر دو گھنٹے رعایا کی شکایات و ضروریات کے سننے اور ان کی تعمیل میں مصروف رہتا۔ یہ سلسلہ عصر تک جاری رہتا۔

نمازِ مغرب کے بعد پھر قصر میں اجتماع ہوتا، اعیان و عوام سب حاضر ہوتے۔ عام مجلس ہوتی، امیر سعود بھی حاضر ہوتا، شیخ سلیمان بن عبداللہ بن شیخ الاسلامؒ (مقتول ۱۲۳۳ھ) صحیح بخاری کا درس دیتے۔ ابن بشر (جو ان مجلسوں میں حاضر ہوتا رہا) شیخ سلیمان بن عبداللہ کی وسعتِ نظر کا غیر معمولی طور پر مداح ہے۔

یہ امیر سعود بن عبدالعزیز کی اجمالی سیرت تھی، تفصیل کے لیے "عنوان المجد"[1] کا مطالعہ کافی ہوگا۔

سعود کے تدبر اور جنگی صلاحیتوں کا برائج[2] بھی خاص طور پر ذکر کرتا ہے۔ برک ہارٹ[3] نے اس کا خاص وصف یہ بتایا ہے:

"کہ وہ حملوں میں رازداری اور اخفاء کا بہت خیال رکھتا تھا۔ حوران (شام) پہنچنے میں اسے ۵۳ دن لگے لیکن اس کے حملے کی خبر صرف دو

---

[1] ج ۱، ۱۶۲-۱۶۵۔ [2] ص ۸۰۔ [3] ص ۱۷۰

دن پہلے پہنچ سکی۔"

عبد العزیز بن سعود اور خاص کر سعود بن عبد العزیز کے عہد میں امن و امان کا ذکر کرتے ہوئے برک ہارٹ کہتا ہے[1]:-

"غالباً پیغمبر عرب کے بعد پہلی بار ملک میں ایسا امن و امان قائم ہوا کہ بدوؤں کو اپنے مال و متاع اور مویشیوں کی طرف سے بے فکر ہو کر آرام سے سونے کا موقع ملا ...... الخ"

اسی طرح رعب کا یہ عالم تھا:-

"کہ ایک معمولی حبشی غلام بڑے سے بڑے قبیلے کے سردار کو یکہ و تنہا گرفتار کر کے درعیہ لے آتا تھا[2]۔"

عبد اللہ بن سعود بن عبد العزیز ۱۲۲۹ھ - ۱۲۳۳ھ / ۱۸۱۴ء - ۱۸۱۸ء

سعود کی وفات کے بعد اس کا بڑا بیٹا عبد اللہ جانشین ہوا۔ یہ بہادری میں اپنے باپ سے کم نہیں تھا۔ لیکن حزم و سیاست میں بہت پیچھے تھا۔ اپنے کو خطرات سے گھرا ہوا پا کر اس نے حریف سے صلح کرنا چاہی۔ اس حریف سے جو نجد کے ملیامیٹ کر دینے کی قسم کھا چکا تھا وہ صلح کیوں کرتا اور جب اس نے صلح بھی کی تو عہد پر قائم نہ رہ سکا۔

آئیے اب ہم میدانِ جنگ کی طرف پھر متوجہ ہوں۔ بحر احمر کے ساحل قنفذہ ان کے قبضہ میں آ چکا تھا۔ اب محمد علی نے عابد بن بک کو ایک بڑی فوج دے کر زہران (یمن) کی طرف بھیجا۔ راستہ میں قنفذہ پر مصریوں نے قبضہ کر لیا۔ نجدیوں کو خبر ملی تو پھر انہوں نے قنفذہ کو دوبارہ اپنے قبضہ میں کر لیا[3]۔ زہران (یمن) والی مہم میں بھی مصریوں کو زک ہوئی۔ زہران کی شکست سے

---

[1] ص ۱۳۷ ۔ [2] ص ۱۳۹

[3] جمادی الاولیٰ ۱۲۲۹ھ / مئی ۱۸۱۴ء ۔ [4] شوال ۱۲۲۹ھ ستمبر۔ اکتوبر ۱۸۱۴ء

فیصل بن سعود کی ہمت بڑھی۔ وہ ابھی تک طائف کے قریب ڈٹا ہوا تھا۔ اب اس نے طائف پر حملہ کی ٹھانی اور طوسون بن محمد علی کی حالت پریشان کن ہو چلی تھی کہ محمد علی کمک لے کر آگیا اور فیصل کو پھر پیچھے ہٹنا پڑا۔ طائف کے قریب بسل میں سخت معرکہ ہوا اور مصریوں کی فتح ہوئی[1]

"اس بسل کے معرکہ میں پانچ ہزار سے زیادہ وہابی کام آئے، ایک سر کی قیمت [illegible] ڈالر رکھی گئی تھی۔ محمد علی کے سامنے لاشوں کا ڈھیر لگ گیا۔ اسی معرکہ کے بعد سے وہابیوں کی قوت کمزور ہوئی۔ انھوں نے غلطی یہ کی کہ پہاڑیوں سے نکل کر کھلے میدان میں آگئے۔ سعود کی وصیت تھی کہ مصریوں اور ترکوں سے کبھی کھلے میدان میں مقابلہ نہ کیا جائے[2]

معرکہ بسل کے بعد محمد علی نے جو مظالم ڈھائے اس کی داستان انتہائی لرزہ خیز ہے۔ برک ہارٹ جو ان واقعات کا عینی شاہد ہے، ان مظالم کی انتہائی مذمت کرتا ہے۔ ایک معمولی واقعہ یہ ہے کہ مقتول وہابی سپاہیوں کی لاشیں کتوں کے لیے چھوڑ دی گئی تھیں[3]۔ محمد علی نے بڑھ کر تربہ پر بھی قبضہ کر لیا[4] تربہ کے آس پاس کے قبائل کو مطیع کرتا ہوا وہ عسیر تک پہنچ گیا اور وہاں سے قنفذہ ہو کر مکہ مکرمہ واپس ہوا پھر ایک فوری ضرورت کی بنا پر اسے مصر جانا پڑا[5]۔

ابھی محمد علی عسیر کی مہم سے فارغ ہو کر تہامہ پہنچا بھی نہ ہوگا کہ اس کا بیٹا مدینہ منورہ میں نجد پر حملہ کی تیاریاں کرنے لگا۔ بڑھ کر وہ قصیم کے بعض مشہور مقامات (رس وغیرہ) پر قابض ہو گیا لیکن مدینہ کے ساتھ رسل و رسائل کا تعلق نجدی جتھوں کی وجہ سے منقطع ہو گیا اور پھر اسے اپنے باپ

---

[1] آغاز ۱۲۳۰ھ اواخر ۱۸۱۴ء۔ [2] برک ہارٹ: ص ۳۱۸ - ۳۱۷۔ [3] ایضاً: ص ۳۲۳ نیز برائج: ص ۹۲۔ [4] ۳ صفر ۱۲۳۰ھ ۱۵ جنوری ۱۸۱۵ء یہ مارد تمان کا بیان ہے، ابن بشر نے تاریخ کی تعیین نہیں کی جبرتی (۴: ۲۱۸) کے فتح تربہ کی خبر مصر ۹ ربیع الاول ۱۲۳۰ھ کو پہنچی۔ برک ہارٹ نے مکہ مکرمہ سے محمد علی کی روانگی کی تاریخ ۲۹ محرم ۱۲۳۰ھ (۷ جنوری ۱۸۱۵ء) بتائی ہے۔

[5] عنوان: ۱: ۱۸۱۔

کی خبر نہ مل سکی جو حقیقت میں اس وقت تک مصر کے لیے رخت سفر باندھ چکا تھا۔ محمد علی حجاز سے جیزہ (مصر) ۱۵ ارجب ۱۲۳۰ھ۔ ۲۳/۲۵ جون ۱۸۱۵ء کو پہنچا۔ ادھر عبداللہ بن سعود نے اسے گھیر لیا اور مصری کوئی دو مہینے اسی حال میں پڑے رہے۔ مجبوراً صلح کی سلسلہ جنبانی کرنی پڑی۔

صلح اور فریب

"اور فریقین کے درمیان صلح ہوگئی۔ طوسون اور عبداللہ دونوں لڑائی ختم کرنے پر متفق ہوگئے۔ (یہ بھی طے ہوا، کہ ترک (یعنی مصری) نجد اور اس کے علاقوں سے اپنا قبضہ اٹھالیں گے۔ ترکی، شام، مصر سے نجد آنے اور جانے والوں کے لیے پرامن ہوگا اور سب کے لیے حج کی آزادی ہوگی اور سبھوں نے شرط نامے (سجل) لکھ دیئے۔"

"اور ترک (مصری) رس سے پہلی شعبان کو (۱۲۳۰ھ/ ۹ جولائی ۱۸۱۵ء) مدینہ کی طرف روانہ ہوگئے۔ عبداللہ (بن سعود) نے صلح کا خط دے کر اپنے دو آدمی (عبداللہ بن محمد بن بنیان" اور قاضی عبدالعزیز بن عمر بن ابراہیم) بھی ان کے ساتھ بھیجے کہ وہ مصر جاکر محمد علی کے سامنے اسے پیش کریں۔ وہ لوگ مصر پہنچے اور واپس ہوئے اور صلح مکمل ہوگئی۔"[2]

کہا جاتا ہے کہ اس صلح نامہ کی رو سے عبداللہ نے سلطان (قسطنطنیہ) کی ماتحتی قبول کر لی تھی اور کسی قریبی موقع پر "آستانہ" خلافت پر حاضری کا وعدہ بھی کر لیا تھا۔[3] طوسون نے بھی جواب میں نجدی علاقہ کے خالی کرنے اور نجدیوں کو حج کی پوری آزادی دینے کا وعدہ کر لیا۔"[4]

---

[1] جبرتی ۴، ۲۲۰، برک ہارٹ (ص ۳۴۹) محمد علی کے قاہرہ پہنچنے کی تاریخ ۲۵ جون ۱۸۱۵ء بتاتا ہے۔

[2] عنوان: ص ۱۸۳ — [3] برک ہارٹ: ابن بشر اور جبرتی جیسے مستند اور معاصر مورخ "دارالخلافت" کی حاضری کا بالکل ذکر نہیں کرتے۔ بلنٹ اور فلبی وغیرہ شد و مد کے ساتھ اس کا ذکر کرتے ہیں۔

[4] فلبی: ص ۹۷: بلنٹ: ۲، ۲۵۸

واقعہ یہ ہے کہ اس وقت عبداللہ کی حالت بہتر تھی اور تمام جنوبی علاقوں سے اس کے پاس کمک آرہی تھی۔ وہ نزاکت کو سمجھتا اور چاہتا تو مصریوں کی وقتی کمزوری سے فائدہ اٹھا کر ان کا قلع قمع کر دیتا لیکن اس نے صلح کر کے یہ زریں موقع کھو دیا۔ طوسون، امن و امان کے ساتھ مدینہ لوٹ گیا[1]۔

ابن بشر اور قلبی کے مندرجہ بالا بیانات بتاتے ہیں کہ طوسون اور عبداللہ کے درمیان صلح ہوگئی۔ ابن بشر تو یہاں تک کہتا ہے کہ عبداللہ کے قاصد مصر سے کامیاب واپس ہوئے[2]۔

قلبی کہتا ہے کہ "محمد علی پاشا نے یہ صلح ناپسند کی اور درعیہ کی تباہی کی دھمکی دیتے ہوئے عبداللہ سے فوراً آستانہ پہنچنے کا مطالبہ کیا۔" عبداللہ اپنے کو ارباب حکومت کے قدموں پر ڈالنے کو تیار نہیں تھا۔ اس لیے وہ اپنے مطیع قبائل کو منظم کرنے اور اپنے پایہ تخت کے استحکام میں لگا رہا[3]۔

عبداللہ کے قاصد مصر میں

ابن بشر اور قلبی کے علاوہ جبرتی اور دوسرے مؤرخوں کے بیانات سے پتہ چلتا ہے کہ صلح کی تکمیل محمد علی کی منظوری پر موقوف تھی اور اسی غرض سے عبداللہ نے دو قاصد اس کی خدمت میں بھیجے، جو طوسون اور عبداللہ کے معاہدہ کے بعد پہلی شعبان ۱۲۳۰ھ (۹ جولائی ۱۸۱۵ء) کو مدینہ ہوتے ہوئے مصر روانہ ہو گئے۔ شوال کے آغاز میں وہ مصر پہنچے[4] اور وہ پاشا کی خدمت میں حاضر ہوئے

"لیکن پاشا کو یہ صلح خوش نہ آئی اور اس نے آنے والوں کی خاطر مدارات نہ کی بلکہ ان کے ساتھ خشونت سے پیش آیا[5]۔

اور جبرتی کے بیان کے مطابق نجدی قاصدوں نے نرمی اور عاجزی کے ساتھ گفتگو کی۔ سعود بن عبدالعزیز کی شدت اور عبداللہ بن سعود کی نرم مزاجی کا ذکر کیا۔

---

[1] برک ہارٹ: ص ۳۴۷: اواخر جون ۱۸۱۵ء۔ [2] عنوان: ۱، ۱۸۳۔ [3] قلبی: ص ۹۷۔
[4] جبرتی: ۴، ۲۲۹۔ [5] ایضاً

جبرتی ان نجدی قاصدوں (عبداللہ بن محمد بن بنیان اور قاضی عبدالعزیز بن حمد بن ابراہیم کے شوقِ علم اور حسنِ اخلاق کا شاندار الفاظ میں ذکر کرتا ہے۔ برک ہارٹ نے بھی سعود کے قاصدوں اور ان کے علم وفضل کی تعریف کی ہے۔ وہ یہ بھی لکھتا ہے کہ علمائے مصر ان کی گفتگو و بحث سن کر مطمئن ہو گئے۔[1]

اس وقت کے نجدیوں کے اخلاق وعلم کا اندازہ کرنے کے لیے معاصر اور عینی شاہد جبرتی کی یہ رائے سننے کے لائق ہے :-

"وہ دونوں جامع ازہر ایسے وقت گئے، جب کوئی صاحب تدریس وہاں موجود نہ تھا۔ انہوں نے امام احمد بن حنبل کے اہل مذہب اور فقہ حنبلی کی کتابوں کے متعلق استفسار کیا۔ ان سے کہا گیا کہ وہ لوگ مصر میں بالکل ختم ہو گئے اور ان دونوں نے تفسیر اور حدیث کی مختلف کتابیں (جیسے خازن، کشاف، بغوی، صحاح ستہ وغیرہ) خریدیں۔ میں ان دونوں سے دو مرتبہ ملا۔ میں نے ان میں انس، فصاحتِ زبان، وسعتِ نظر اور معلومات کی فراوانی پائی اور ان کی عاجزی، حسن خلق، ادب، تفقہ اور فقہی مسائل و اختلافات پر عبور کی تو تعریف ہی نہیں ہو سکتی۔ ان میں سے ایک کا نام عبداللہ اور دوسرے کا عبدالعزیز ہے اور دوسرا ہر اعتبار سے افضل ہے۔"[2]

عبداللہ بن سعود کے قاصدوں کا حال اور محمد علی پاشا کا اور ان کے ساتھ برتاؤ دونوں کے متعلق آپ ایک معاصر مصری مؤرخ کی زبانی سن چکے۔ تفصیل میں پڑنے کی گنجائش نہیں۔ خلاصہ یہ ہے کہ مختلف اسباب[3] کے ماتحت، جن میں مورخوں[4] کا اختلاف ہے، محمد علی نے صلح مسترد

---

[1] برک ہارٹ : ص ۱۱۳

[2] جبرتی : م ۲۲۵۔ [3] خلاصۃ الکلام : ص ۳۸۔ [4] ملاحظہ ہو : ابن بشر (۱، ۱۸۵) مارونمان، نلینی ص ۹۷۔ حاضر العالم الاسلامی (۴، ۱۶۶)

کر دی۔ طوسون کو جو ذی قعدہ تک حجاز ہی میں مقیم رہا،[1] مصر واپس بلا لیا گیا۔ اوائل ذی الحجہ ۱۲۳۰ھ (نومبر ۱۸۱۵ء) میں وہ مصر پہنچ گیا اور تقریباً ایک سال کے بعد دارِ آخرت کی راہ لی۔[2] گو انتقال سے پہلے ہی وہ قیادت سے محروم کیا جا چکا تھا۔ مار دتمان کا یہ خیال صحیح نہیں، کہ طوسون کی وفات کے بعد ابراہیم کو اس مہم کا ذمہ دار بنایا گیا۔ ابراہیم کے بھیجنے کی تجویز جنوری ۱۸۱۶ء ہی میں مکمل ہو چکی تھی اور اگست ۱۸۱۶ء میں یعنی طوسون کے انتقال سے پہلے وہ قاہرہ روانہ ہو چکا تھا۔[2] ابن بشر[3] کے مطابق عبداللہ بن سعود نے دوسرے سال ۱۲۳۱ھ (۱۸۱۶ء) بھی ہدیوں اور تحفوں کے ساتھ دو قاصد (حسن بن مزروع اور عبداللہ بن عون) محمد علی کی خدمت میں مصر بھیجے اور اب ان کے بھولے بھالے لوگوں نے محسوس کیا کہ والیٔ مصر اپنے عہد سے پھر گیا ہے (وبدوہ قد تغیّر) حالانکہ محمد علی نے کبھی صلح کی تائید کی ہی نہیں البتہ ان کے پہلے دو قاصدوں کو اس نے صاف جواب نہیں دیا تھا۔ اسی سے ابن بشر اور اہل نجد نے محسوس کیا کہ صلح مکمل ہو گئی اور ان کے قاصد کامیاب لوٹے (ورجعوا منہ وانتظم الصلح)[4] ابن بشر مزید لکھتا ہے کہ محمد علی پاشا نے بعض اہل بادیہ کی "وشایت" کی بنا پر صلح ختم کر دی۔ نامناسب نہ ہوگا، اگر اس سلسلے میں بعض یورپی معاصروں کی رائے بھی سن لی جائے:-

"...... اب صرف سوال یہ رہ جاتا ہے کہ معاہدہ کی تکمیل محمد علی کی منظوری پر اٹھا رکھی گئی تھی یا طوسون نے جو مرتبہ (RANK) میں اپنے باپ کے برابر تھا قطعی طور پر (AS A THING DONE) اس کی تکمیل کر دی تھی، بہر حال معاملہ کچھ بھی ہو، اس نے صلح کر کے اپنا نقصان کیا۔ محمد علی نے اسے بابِ عالی میں محض ایک ہنگامی صلح یا التوائے جنگ (ARMISTICE) بنا کر پیش کیا۔"[5]

---

[1] ۷، ذی قعدہ ۱۲۳۱ھ ۲۹ ستمبر ۱۸۱۶ء: جبرتی: ۴، ۲۶۴۔ [2] برک ہارٹ: ص ۱۰۴۔ [3] ابن بشر (۱، ۱۸۵) آخر شوال ۱۲۳۱ھ تاریخ وفات بتاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ مصر اور مصریوں کے متعلق جبرتی کے بیان کو ترجیح ہو گی۔ [3] عنوان: ۱/ ۱۸۳۔ [4] ایضاً: ۱، ۱۸۵۔ [5] برک ہارٹ ص ۲۵۲، براج ص ۱۰۳۔

برک ہارٹ اس گفت وشنید میں عبداللہ بن سعود کی صفائی اور صاف دلی کی تعریف کرتا ہے ، اس کے خطوط بھی برک ہارٹ نے دیکھے تھے ۔ برک ہارٹ اور براج یہ بھی کہتے ہیں کہ محمد علی نے بعد میں الحسا کے زرخیز صوبہ کا مطالبہ کیا اور اسی کے ایفاء پر صلح نامہ کی تصدیق ملتوی رکھی ۔

ابراہیم پاشا

بہر حال ، حقیقت جو کچھ بھی ہو ، طوسون اور عبداللہ بن سعود کے باہمی معاہدے سے غیر مطمئن محمد علی پاشا ، والی مصر نے اب نجد کی مہم کے لیے اپنے دوسرے بیٹے ابراہیم پاشا کو نامزد کیا ، تیاریاں طوسون کی واپسی کے بعد ہی شروع ہو گئی تھیں ، البتہ ابراہیم پاشا کی روانگی ایک عرصہ تک ملتوی رہی ، وہ ایک بڑی بھاری فوج لے کر ۶ ، ذی قعدہ ۱۲۳۱ھ ۲۸ ستمبر ۱۸۱۶ء کو ینبع پہنچا اور رسید سے[1] مدینہ کا رخ کیا اور وہاں سے چل کر حناکیہ (پانی کا چشمہ) کے پاس ٹھہرا ، آس پاس کے بدوی قبیلے مطیع ہوئے ، حرب ، مطیر عتیبہ اور عنزہ قبیلوں سے جوق در جوق بدو اس کے جھنڈے کے نیچے مجتمع[3] ہو گئے ۔ ابراہیم حناکیہ کے پاس مہینوں رہ گیا ، جس کا آس پاس کے بدو قبیلوں پر کافی اثر ہوا اور وہ ٹوٹ ٹوٹ کر ابراہیم کے پاس جانے لگے ۔ عبداللہ کو اس کا احساس ہوا اور آخر اس نے پیش قدمی کی ۔ ماویہ (پانی کا چشمہ) کے پاس مڈبھیڑ ہوئی ، لیکن عبداللہ بن سعود کی فوج مصری توپوں کی تاب نہ لا سکی[4] ۔ عبداللہ قصیم کی طرف پلٹا ۔ ابراہیم نے بھی پیچھا کیا اور رس آکر ٹھہرا[5] اور تین مہینے کے محاصرہ کے بعد اہل شہر نے امان طلب[6] کی ۔ اس طویل محاصرہ اور مسلسل چھیڑ چھاڑ میں مصریوں کے چھ سات

---

[1] ص ۳۵۲ ۔ [2] کہا جاتا ہے کہ ابراہیم پاشا محمد علی کا لڑکا نہیں تھا بلکہ محمد علی نے ابراہیم کی ماں سے نکاح کر کے اسے اپنا بیٹا بنا لیا تھا (عنوان : ا / ۱۸۵ ، فلبی : ۹۸ ، ہوگارتھ ص ۱۰۱

[3] اواخر ۱۲۳۱ھ نومبر ۱۸۱۶ء ۔

[4] وسط جمادی الآخرۃ ۱۲۳۲ھ / ۲ ، مئی ۱۸۱۷ء ۔ [5] اواخر شعبان ۱۲۳۲ھ / اوائل جولائی ۱۸۱۷ء

[6] ۱۲ ، ذی الحجہ ۱۲۳۲ھ / ۲۳ ، اکتوبر ۱۸۱۷ء

سو آدمی کام آئے اور اہلِ شہر کے صرف ستر آدمی مقتول ہوئے لیکن اس امان طلبی سے مصریوں کا راستہ صاف ہو گیا اور ان کی پیش قدمی کو اب کوئی طاقت نہیں روک سکتی تھی۔

معمولی حملوں کے بعد عنیزہ اور خبرا پر قبضہ ہو گیا (اواخر ۱۲۳۲ھ) بریدہ پر بھی قبضہ میں وقت نہ ہوئی۔ البتہ[1] شقراء میں نجدیوں نے دل کھول کر دادِ شجاعت دی لیکن مصری فوج کے فرانسیسی انجینیر[2] (VAISSIERE) کی ترکیبوں کے سامنے ان کی ایک نہ چلی اور اہل شقرا نے بھی امان طلب کی[3]۔

اس کے بعد ایک اور فیصلہ کن جنگ ضرمی کے قریب ہوئی۔ نجدی علاقے میں پایۂ تخت درعیہ کے بعد سب سے مستحکم شہر ضرمی ہی تھا۔ اس سے پہلے رس اور شقراء کے باشندے بھی بہادری سے لڑے لیکن آخر امان طلب کرنے پر مجبور ہوئے۔ ان دونوں کے برعکس ضرمی "عنوۃ" فتح ہوا۔ بازاروں اور گھروں میں باشندے قتل کیے گئے اور تمام مال و متاع فاتحوں نے لوٹ لیا اور بلنٹ (۲ : ۲۶۰) کے بیان کے مطابق عورتوں کی آبرو بھی ترکی سپاہ کے ہاتھوں محفوظ نہ رہی۔ ۱۷ ربیع الثانی ۱۲۳۳ھ / فروری ۱۸۱۸ء کو ضرمی میں مصریوں کا داخلہ ہوا، یہ گویا نجدی حکومت کے زوال کا اعلان تھا۔

---

[1] محرم ۱۲۳۳ھ / نومبر ۱۸۱۷ء۔ [2] ابراہیم کے ساتھ اس فرنچ انجینیر کے علاوہ چار اطالوی ڈاکٹر بھی تھے ان کے نام یہ ہیں:- SCOTS, GENTILI TODESCHINI SOCIO (ہوگارتھ: ص ۱۰۱) ان میں SCOTS اس کا خاص طبیب تھا۔ عسیر اور یمن کی مہموں میں بھی مصری فوج میں متعدد یورپی افسر تھے (ہوگارتھ: ص ۱۲۷، ۱۲۳)

برک ہارٹ، طوسون کی فوج کے ایک انگریز افسر THOMAS KEITH اس کی بہادری کا ذکر کرتا ہے۔ یہ اسلام لے آیا تھا اور ابراہیم آغا کے نام سے موسوم تھا۔ وہ یہاں تک کہتا ہے کہ خود عبداللہ بھی اس کی شجاعت کا مداح و معترف تھا۔

[3] ۱۲ ربیع الاول ۱۲۳۳ھ۔ ۲۲ جنوری ۱۸۱۸ء : بلنٹ ۲، ۲۶۰

سعود بن عبد اللہ بن محمد بن سعود اور اس کے ساتھ کچھ درعیہ کے جاں نثار شہر کے ایک قصر میں قلعہ بند ہو گئے۔ آخر انہیں بھی امان دی گئی اور وہ لوگ درعیہ چلے گئے ان کے ساتھ اہل شقرا کے تین ہزار سے اوپر بچے اور عورتیں بھی تھیں ان سب کو امیر عبد اللہ بن سعود بن عبد العزیز نے درعیہ میں پناہ دی[۱]۔

سقوط درعیہ

اب ابراہیم پاشا درعیہ کے سامنے تھا، جہاں وہ چھ ماہ تک محاصرہ کیے پڑا رہا۔ روزانہ جنگ ہوتی اور مصری بڑی تعداد میں کام آتے لیکن وہاں آئے دن مصر سے تازہ دم کمک آتی رہتی اور یہاں درعیہ والوں کی تعداد روز کم ہوتی جاتی۔ رسد اور اسلحہ کی کمی الگ انہیں ستاتی تھی۔ امیر عبد اللہ بن سعود، اس کے اہلِ خاندان اور شیخ الاسلامؒ کے بیٹے، پوتے سب بلا استثناء جی کھول کر لڑے۔ آخر اہلِ شہر نے صلح و امان طلب کی[۲]۔ عبد اللہ بن سعود کو اب بھی ہتھیار ڈالنے میں پس و پیش تھا۔ شہر کے اندر اپنے خاندانی قلعہ (طریف) میں پناہ گزیں ہو کر لڑنے لگا۔ لیکن قلعہ کی دیواریں بے کار ہو چکی تھیں اور اب مدافعت بے کار تھی۔ آخر اس نے اپنے کو ابراہیم کے سپرد[۳] کر دیا اور یہ پہلی سعودی حکومت اور فلبی کی زبان میں "فرسٹ وہابی ایمپائر" (جس کی تعمیر میں شیخ الاسلامؒ اور ان کے ہم جلیسوں کا بڑا ہاتھ تھا)، کے خاتمہ کا اعلان تھا۔

عبد اللہ بن سعود کا حشر

صلح کے دو روز بعد عبد اللہ بن سعود کو سفر کا حکم دیا گیا۔ تین چار آدمی اس کے اپنے بھی ساتھ رہے۔ امیر نجد کا قافلہ محرم ۱۲۳۴ھ (نومبر ۱۸۱۸ء) کے اوائل میں مصر پہنچا، اس کا داخلہ نہایت مضحکہ انگیز صورت میں ہوا۔ بے چارے کو مصریوں نے تماشا بنا لیا تھا۔ خلاصہ یہ کہ ایک شکست خوردہ والی مملکت کے ساتھ جو کچھ بدسلوکی روا رکھی جا سکتی تھی اس میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی گئی[۴]۔ محمد علی کی

۱؎ عنوان: ۱: ۱۹۳۰۔ ۲؎ ۷ ذی قعدہ ۱۲۳۳ھ، ۸ ستمبر ۱۸۱۸ء؛ عنوان: ۱، ۲۰۶، ماروتمان نے سقوط درعیہ کی تاریخ ۶ ستمبر ۱۸۱۸ء دی ہے۔ ۳؎ ۹ ستمبر ۱۸۱۸ء: ماروتمان، فلبی: ص ۱۰۳۔

۴؎ جبرتی ۱۰، ۲۹۸، خلاصۃ الکلام: ص ۳۰۲۔

خدمت میں وہ حاضر ہوا کچھ ضابطہ کی باتیں ہوئیں اور ۱۹ محرم کو اسکندریہ اور وہاں سے آستانہ بھیج دیا گیا۔ جہاں موت اس کی راہ دیکھ رہی تھی۔ ۱۷ دسمبر ۱۸۱۸ء (۱۸ صفر ۱۲۳۳ھ کو وہ اور اس کے ساتھی، ایا صوفیا کے صحن میں پھانسی کے تختہ پر لٹکا دیئے گئے (انا للہ وانا الیہ راجعون)، قابل ذکر بات یہ ہے کہ دارالخلافت میں بھی ان مقہوران بلا کو بری طرح سے گشت کرایا گیا۔

عبداللہ بن سعود بن عبدالعزیز بن محمد سعود کے ساتھ امرار نجد کا وہ سلسلہ ختم ہو جاتا ہے جو براہ راست شیخ الاسلامؒ سے مستفید ہوا تھا، عبدالعزیز بن محمد بن سعود اور سعود بن عبدالعزیز تو شیخ الاسلامؒ کے باضابطہ شاگرد تھے، عبداللہ بن سعود کی عمر شیخ الاسلامؒ کی وفات (۱۲۰۶ھ) کے وقت کم رہی ہوگی، اس لیے ممکن ہے کہ وہ باضابطہ ان کے درس سے نہ مستفید ہوا ہو پر اتنا یقینی ہے کہ اس نے شیخ الاسلامؒ کا زمانہ پایا تھا۔

عبداللہ کو اطمینان سے حکومت کا موقع بالکل ہی نہیں ملا، پھر بھی درس و تبلیغ نیز انتظام حکومت میں وہ اپنے باپ اور دادا کے نقش قدم پر رہا اور اس سلسلہ میں کوئی نئی بات قابل ذکر نہیں[۲]۔

باقی لوگوں کا انجام

درعیہ کے اندر اور باہر مسلسل چھ مہینے لڑائی ہوتی رہی، ان معرکوں کی تفصیل اس کتاب کی محدود گنجائش اور اس کے موضوع بحث سے خارج ہے۔ ان واقعات کے معاصر اور شاہد ابن بشر نے پوری تفصیل دی ہے۔ بلکہ شہر کے مختلف مورچوں اور ان کے جائے وقوع کی بھی کافی توضیح کی ہے[۳]۔

اس لڑائی میں صرف آل سعود کے اکیس افراد شہید ہوئے ان میں سے ممتاز اشخاص

---

[۱] مارو تمان اور HUGHES (ص ۶۶۰) نے پھانسی کی تاریخ ۱۹ دسمبر لکھی ہے۔ ابن بشر اور جبرتی نے تاریخ کی تعیین نہیں کی۔ [۲] عنوان: ۱، ۲۰۹

[۳] عنوان المجد: ۱، ۲۰۸ - ۱۹۴-

کے نام یہ ہیں :- فیصل[1] بن سعود، ابراہیم[2] بن سعود، فہد[3] بن عبداللہ بن عبدالعزیز، فہد[4] بن ترکی بن سعود، محمد[5] بن حسن مشاری بن سعود، ابراہیم بن حسن[6] بن مشاری، عبداللہ[7] بن حسن مشاری، عبدالرحمٰن[8] بن حسن بن مشاری، عبداللہ[9] بن ابراہیم بن حسن بن مشاری، ابراہیم[10] بن عبداللہ بن فرحان، عبداللہ بن ناصر[11] بن مشاری، محمد بن عبداللہ[12] بن سعود، سعود بن عبداللہ[13] بن محمد بن سعود، محمد بن سعود بن عبداللہ[14] بن محمد بن سعود، اور آل الشیخ میں سے مندرجہ ذیل اشخاص شہید کیے گئے :-

سلیمان[1] بن عبداللہ بن الشیخ، علی[2] بن عبداللہ بن الشیخ، محمد بن عبدالرحمٰن[3] بن حسن بن الشیخ۔ ان میں سے سلیمان بن عبداللہ کی لاش کے ٹکڑے ٹکڑے کیے گئے اور پورے جسم کی تکا بوٹی کی گئی۔ اللہ رے جوشِ انتقام[1] !!

آل سعود اور آل الشیخ کے علاوہ مندرجہ ذیل علماء اور اعیان شہید ہوئے۔ ان میں سے بعض میدانِ جنگ میں کام آئے اور اکثر سنگینوں، بندوقوں اور مختلف قسم کی اذیتوں کا شکار ہوئے۔

علی بن حمد بن راشد عرینی، قاضی خرج، صالح بن رشید الحربی، عبداللہ بن محمد بن عبداللہ بن سویلم، حمد بن عیسیٰ بن سویلم، محمد بن ابراہیم بن سدحان[2]۔

ان مقتولین کے علاوہ بعض مشہور اہلِ علم کے ساتھ ابراہیم پاشا انتہائی بدتمیزی سے پیش آیا۔ قاضی احمد بن رشید الحنبلی، مدینہ کے مشہور عالم امیر عبداللہ کے ہاں مقیم تھے۔ زدوکوب سے ان کی تواضع کی گئی اور تمام دانت اکھاڑ ڈالے گئے[3]۔

یہ قاضی احمد بن رشید بن کا پورا نام احمد بن حسن رشید ہے، احساء کے رہنے والے اور فقہ حنبلی کے مشہور عالم تھے۔ عام طور پر "الحنبلی" کے نام سے شہرت تھی۔ پہلے یہ شیخ کی دعوت کے مخالف تھے، پھر مؤید ہو گئے، مدینۃ الرسول کا جوار پسند آگیا تھا۔ وہیں متوطن

---

[1] عنوان: ۱، ۲۱۰۔ [2] ایضاً: ۱، ۲۰۸

[3] ایضاً

ہو گئے، بڑی عمر پاکر وہیں وفات[1] پائی۔

"الحسب الوابلۃ" (ص ۳۵-۳۲) میں ان کا مفصل ذکر ہے لیکن ان کے قبول دعوت کی "السحب" کے مصنف نے عجیب و غریب تاویلیں کی ہیں۔

اسی سلسلہ میں شیخ عبد العزیز الحصین ناصری (ف ۱۲۳۷ھ) جیسے ضعیف عالم اور بزرگ کے ساتھ بدسلوکی کا قصہ بھی آتا ہے۔ فتح شقرا کے وقت شیخ عبد العزیز الحصین بھی وہاں تھے۔ ابراہیم پاشا نے انہیں اپنی مجلس میں بلوایا، ضعیفی کی وجہ سے وہ خود نہ آسکتے تھے، مجبوراً لوگ اٹھاکر لائے (فجئ بہ محمولاً)

انہوں نے آتے ہی مسنون طریقہ پر :-

"سلام" علیکم یا ابراہیم"

کہا۔ مصری پاشا کی پرغرور پیشانی پر شکن پڑ گئی اور وہ شیخ عبد العزیز کا تمسخر کرنے لگا۔ شیخ نے نصیحت کی اور "عفو" کی چند آیتیں پڑھیں تو پاشا نے کہا :-

"جا بڈھے میں نے تیرا قصور معاف کیا[2]"

یہ وہی شیخ عبد العزیز ہیں جو شیخ الاسلامؒ کے خاص شاگرد تھے اور خود ان کی زندگی میں دو مرتبہ (۱۱۸۵ھ - ۱۲۰۴ھ) وفد کی حیثیت سے حجاز بھیجے گئے۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو (پہلا باب)

اس دار و گیر سے جو خوش نصیب بچ کر نکل سکے ان میں ترکی بن عبد اللہ بن محمد بن سعود (جس کے ہاتھ آگے چل کر نجدی حکومت کی تجدید ہوئی) اور شیخ علی بن حسین بن شیخ الاسلامؒ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ آل سعود کے بعض افراد اس وقت تو بچ کر نکل گئے اور جب پھر وہ درعیہ لوٹے تو مصری حاکم نے انہیں پکڑ کر مصر بھیج دیا[3]۔ ان کے علاوہ آل سعود اور آل الشیخ کے باقی ماندہ

---

[1] ۱۲۴۹ھ۔

[2] عنوان : ۱/۱۹۱۔ [3] ۱۲۳۶ھ، خلاصۃ الکلام : ص ۳۰۳

افراد مع اہل وعیال کے مصر بھیج دیئے گئے۔ جہاں یہ غریب الوطن عرصہ تک مقیم رہے بعض وہیں لقمۂ اجل بنے اور اکثر حالات سازگار ہونے پر اپنے وطن کو واپس ہوئے[1] غریب الوطنوں کا یہ قافلہ ۱۸ رجب ۱۲۳۴ھ (۱۳ مئی ۱۸۱۹ء) کو مصر پہنچا۔ ان کی تعداد عورت، مرد اور بچوں کو ملا کر چار سو کے قریب تھی۔ (جبرتی: ۴، ۲۰۳)

درعیہ کی بربادی

درعیہ پر قبضہ ذی قعدہ ۱۲۳۳ھ کے اوائل میں ہوا لیکن اس کی تباہی کا سلسلہ تقریباً ایک سال تک جاری رہا، خود ابراہیم پاشا کوئی نو مہینے وہاں رک گیا، روز نیا حکم جاری ہوتا اور اس کی پابندی کرائی جاتی۔ جب تمام مرحلے طے ہو گئے تو پھر آخر میں ایک ایسی ضرب لگائی گئی جس سے آل سعود کا یہ پہلا پایہ تخت پھر نہ پنپ سکا۔

شعبان ۱۲۳۴ھ (جون ۱۸۱۹ء) میں محمد علی پاشا کا حکم پہنچا اور اس کے مطابق لائق بیٹے (ابراہیم) نے درعیہ کی بربادی کا حکم دیا، پھر کیا تھا:۔

> "مصری فوج نے سارا شہر کھود کر پھینک دیا، تمام باغ و گلستان جڑ سے کاٹ ڈالے۔ بوڑھے، بچے اور کمزور اور بیمار سب یکساں عتاب کا شکار ہوئے۔ گھروں میں آگ لگا دی گئی اور چند روز میں لہلہاتا ہوا باغ جل کر خاک بھسم ہو گیا۔"[2]

یہ مصریوں کے جنون انتقام کا سب سے بدترین مظاہرہ تھا۔ یہ وہ درعیہ ہے، جو شیخ کی دعوت سے پہلے ایک چھوٹا سا گاؤں تھا، شیخ کی دعوت نے اسے مرکزیت بخشی

---

[1] ان ہی واپس ہونے والوں میں نجد کے دو مشہور عالم شیخ عبد الرحمٰن بن حسن بن شیخ الاسلامؒ اور ان کے صاحبزادے شیخ عبد اللطیف بن حسن بھی تھے، جن کا ذکر اس کتاب کے پہلے باب میں آ چکا ہے۔ ملاحظہ ہو (ص ۴۸-۴۹)

[2] عنوان المجد، ۲۱۳، تاریخ نجد (آلوسی): ص ۲۶-۲۷۔

اور آل سعود کی کوششوں اور حوصلہ افزائیوں سے تھوڑے عرصہ میں ایک آباد اور خوشحال شہر بن گیا۔ ابن بشر درعیہ کی خوشحالی، رونق اور تجارتی مرکزیت کا شاندار لفظوں میں ذکر کرتا ہے۔ اس سلسلے میں اس کے اپنے چشم دید تاثرات خاص اہمیت رکھتے ہیں[1]۔

سرکار برطانیہ کی مبارکباد اور امداد کی پیشکش

درعیہ کو خاک و سیاہ کرنے کے بعد ابراہیم نجد کے علاقے سے واپس ہوا چاہتا تھا کہ ہماری سرکار کے ہندوستانی افسروں کو ایک عجیب تجویز سوجھی۔ انہوں نے ابراہیم کو مبارکباد دینے کے لیے ایک خاص وفد کپتان جارج GEORGE FORESTER SADLIER کی ماتحتی میں روانہ کیا۔

اس مبارکباد کی تہ میں جو جذبہ کام کر رہا تھا، اس کے سمجھنے کے لئے یہ حقیقت پیش نظر رکھنا ضروری ہے کہ کمپنی کی حکومت خلیج فارس کے ساحل پر اپنا اثر و اقتدار بڑھانے کے لیے عرصہ سے کوشاں تھی۔ نجدی اقتدار ساحل[2] پر بڑھا تو بحری تاخت کی رفتار تیز ہوگئی اور تجارتی جہازوں کو نقصان پہنچنے لگا۔ اس بحری قزاقی (PIRACY) کا خاتمہ کرنے کے لیے حکومت بمبئی نے ۱۲۲۴ھ/۱۸۰۹ء میں قرصان کے مرکز اس الخیمہ پر حملہ کیا اور اسے جلا کر خاک سیاہ کر دیا جس کا ذکر ابھی آچکا ہے۔

اب جو کمپنی کی حکومت کو مصری فتوحات اور نجدیوں کی تباہی کی خبر ملی تو اس کے دل میں خدشہ پیدا ہوا کہ کہیں اس نئی طاقت کے ہاتھوں بھی اس کے اقتدار کو صدمہ نہ پہنچے۔ درعیہ کے قبضہ کے ساتھ ہی کچھ ایسے واقعات پیش آئے جن سے ان کا اندیشہ قوی ہوگیا۔ مصری

---

[1] عنوان : ۱، ۲۱۰۔ [2] یہاں پر یہ ذکر کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ساحل پر نجدی بڑھتے ہی برطانوی افسروں نے نجدیوں سے بھی خلا ملا پیدا کرنے کی کوشش کی تھی۔ بصرہ کے برطانوی ریزیڈنٹ مینستی MANESTY نے ۱۷۹۹ء میں رینانڈ (REINAND) کو خاص اسی غرض سے درعیہ بھیجا تھا اور اس وقت اسے عارضی کامیابی بھی ہوگئی تھی۔ ہوگارتھ (حاشیہ ص ۱۰۴)

فوجی دستے خلیج فارس کے ساحلی علاقوں پر تنگ و تاز کرنے لگے اور اس میں انہوں نے برطانوی حلقہ واثر کا احترام بھی ملحوظ نہیں رکھا۔ برطانوی افسر اپنے نجدی حریفوں کی بربادی پر تو بہت خوش تھے، لیکن مصریوں کے ہاتھوں اس ناروا برتاؤ کے لیے بھی تیار نہیں تھے[1] فوراً کپتان ج۔ ف۔ سیڈلیر کو ابراہیم پاشا کی خدمت میں درعیہ بھیجا گیا تھا۔ اصل میں برطانوی افسروں کو مصریوں کے غرض و غایت کے متعلق غلط فہمی پیدا ہوگئی تھی۔ خلیج فارس تو کجا، مصری نجد پر بھی دائمی قبضہ یا حکومت کرنا نہیں چاہتے تھے۔ درعیہ کی فتح کے ترنگ میں ممکن ہے، انہوں نے آس پاس کے علاقوں پر دستے بھیجے ہوں، لیکن یہ ایک واقعہ ہے کہ پائیدار اور منظم حکومت قائم کرنے کا ارادہ انہوں نے کبھی نہیں کیا اور یہی وجہ ہے کہ ابراہیم پاشا درعیہ کو تباہ کرنے کے بعد سارے علاقے کو عام ابتری کی حالت میں چھوڑ کر مصر روانہ ہوگیا۔

خیر آئیے، ذرا سیڈلیر کے مشن کی سرگزشت ایک واقف کار کی زبانی سنیئے:۔

"مصریوں سے بالواسطہ یا بلاواسطہ کسی طرح کا مشورہ کیے بغیر بمبئی سے ۱۸۱۹ء (۱۲۳۴ھ) کے موسم گرما میں ایک برطانی جنگی جہاز خلیج کی طرف بھیجا گیا۔ اس پر سرکار (HIS MAJESTY) کی سینتالیسویں (FORTY SEVENTH) رجمنٹ کا افسر کپتان ج۔ ف۔ سیڈلیر بھی ایک خاص قاصد (EMISSARY) کی حیثیت سے ساتھ تھا، اس کی مہم کا مقصد "ابراہیم کو درعیہ کے زیر کرنے پر مبارکباد دینا" اور پاشا (HIS EXCELLENCY) سے مل کر وہابی طاقت کے مکمل استیصال کا مناسب انتظام کرنا تھا۔" اس افسر کے ہدایت نامے کے مزید فقرے یہ ہیں:۔

اگر جیسا کہ غالباً صورت حال ہو، پاشا، برطانی حکومت کی امداد سے فائدہ اٹھانا چاہیے تو ایک مکمل اور مضبوط بحری فوجی طاقت جلد از جلد بھیجی جائے گی

---

[1] فلبی: ص ۱۰۳

اور ترکوں (مصریوں) کو راس الخیمہ پر قبضہ دلایا جائے گا۔...... الخ

لیکن تاریخ میں بہت کم ایسے خفیہ مشن ناکام ہوئے ہوں گے۔ جیسا کہ سیڈلیر مشن کی قسمت میں لکھا تھا۔"

تفصیل[1] بہت لمبی ہے۔ خلاصہ یہ کہ سیڈلیر عرب کے ساحل پر اس وقت اترا، جب ابراہیم درعیہ کی بربادی سے سیر ہو کر وطن کی واپسی کا ارادہ کر رہا تھا، بتانے والوں نے اسے بتایا کہ یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ اس سے ملاقات کس مقام پر ہو سکے گی؟ یہ ۲۸ر جون ۱۸۱۹ء کو روانہ ہوا۔ درعیہ کے پاس سے گزرتا ہوا شقرا پہنچا وہاں سے رس آیا۔ یہاں اسے ابراہیم کی فوج تو ملی لیکن خود پاشا مدینہ کے لیے رختِ سفر باندھ چکا تھا، ابراہیم کو اس کی آمد کی اطلاع تھی لیکن وہ کوئی ایسا ملنے کا مشتاق نہیں تھا کہ اس کا انتظار کرتا، آخر مدینہ کے قریب پاشا کی خدمت میں ۸ اور ۹ر ستمبر کو باریابی ہوئی۔

پاشا نے گفتگو تو اخلاق سے کی لیکن کسی قسم کا وعدہ نہیں کیا اور برطانی قاصد ناکام واپس آیا۔ البتہ اس نے تین مہینے کی بادیہ گردی سے ایک بڑا امتیاز حاصل کر لیا۔ یہ پہلا یورپی تھا جس نے جزیرۃ العرب کو ایک سمندر سے دوسرے سمندر تک عبور کر لیا۔

درعیہ مصریوں کے ہاتھوں ایسا برباد ہوا کہ پھر نہ آباد ہو سکا۔ یہ تباہی ایسی حوصلہ شکن تھی کہ ایک عرصہ تک نجدیوں کے پنپنے کی کوئی امید نہیں دکھائی دیتی تھی، بلنٹ[2] جیسے وسیع النظر اور بظاہر عربوں کے ہمدرد مدبر نے ۱۸۸۰ء میں اپنا خیال ظاہر کیا تھا:۔

"عرب میں سعودی خاندان کے اقتدار کو اب قصۂ ماضی سمجھنا چاہیئے۔"

ڈاوتی (DAUGHTY) ۱۸۷۵ء میں اہل نجد کی عام رائے نقل کرتا ہے:۔

"اب وہابی حکومت دوبارہ زندہ نہیں ہونے کی۔ کم از کم نجد میں یہی خیال کیا جاتا ہے۔"

---

[1] تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو۔ ہوگارتھ کی PENETRATION OF ARABIA ص ۱۱۱-۱۰۴

[2] ۲، ۲۶۸۔

اور زویمر[1] جیسے دشمن اسلام نے ۱۹۰۰ء میں یہ رائے ظاہر کی :-

"اس تحریک کا خاتمہ انتہائی ناکامی پر ہوا اور سیاسی طور پر یہ ایک شاندار ڈھونگ ثابت ہوئی"

دوسری جگہ یہی دشمن اسلام و عرب لکھتا ہے :-

"عرب میں سعودی خاندان کے اقتدار کو اب قصہ ماضی سمجھنا چاہیئے"[2]

لیکن یہ خیال غلط نکلا - جزیرۃ العرب کی امانت پھر انہیں نجدیوں کو ملی اور پہلے سے زیادہ وسعت و اقتدار کے ساتھ - ہاں درعیہ پھر نہ بن سکا، نجدی حکومت کی تجدید اور تشکیل درعیہ میں نہیں بلکہ اسی علاقے کے دوسرے مقام ریاض میں ہوئی اور اب وہی ان کا پایۂ تخت ہے -

درعیہ کا مرثیہ

درعیہ کے جاں گداز فاجعہ کا اہل نجد اور ان کے ہمدردوں پر جو کچھ اثر ہوا ہوگا، اس کے بیان کی ضرورت نہیں، رونے والے اپنے اپنے مقدور اور ظرف کے مطابق خون کے آنسو روئے ہوں گے - ہم ذیل میں صرف ایک مرثیہ کی طرف اشارہ کرنا چاہتے ہیں - یہ مرثیہ نجد کے مشہور عالم حمد بن ناصر بن معمر (ف ۱۲۲۵ھ شاگرد شیخ الاسلامؒ) کے بیٹے عبدالعزیز بن حمد بن ناصر

---

[1] صفحہ ۱۹۱

[2] بحوالہ فلبی (ص ۱۰۲) فلبی (ص ۱۶۰) کو حیرت ہے کہ زویمر کا یہ ریمارک اس کتاب کے ۱۹۱۲ء کے ایڈیشن میں بھی اسی طرح قائم ہے، حالانکہ موجودہ سلطان عبدالعزیز بن سلطان عبدالعزیز بن عبدالرحمٰن بن فیصل بن ترکی بن عبداللہ بن محمد بن سعود ۱۹۰۱ء میں ریاض پر قابض ہو چکا تھا - یہاں پر یہ ذکر کرنا نامناسب نہ ہوگا کہ ہوگارتھ (ص ۷۸) نے ۱۹۰۴ء میں اس تحریک کے پنپنے اور دوبارہ بڑھنے کی توقع ظاہر کی تھی - گو ریاض پر دوبارہ قبضہ کے بعد یہ پیشین گوئی کوئی قابل تعریف بھی نہیں البتہ زویمر کا جہل حیرت انگیز ہے -

(ن ۱۲۴۴ھ) کا لکھا ہوا ہے، گو اس میں شریف رندی کے مرثیہ سقوط[۱]..... طلیطلہ یا سعدی کے نوحہ بغداد[۲] کا زور نہیں ہے، پھر بھی اس میں درد ہے اور ایک دیندار قوم کے صبر و شکر کا آئینہ۔ مرثیہ کا مطلع[۳] یوں ہے:-

الیك اله العرش نشکو اتضرعا وادعوك فی ضراء ربی لتسمعا

نمونہ کے طور پر دو چار شعر اور درج ہیں:-

وکم قتلوا من عصبة الحق فتیة هداة وضاة ساجدین ورکعا

وکم دمروا من مربع کان اهلا فقد ترکوا الدار الانیسة بلقعا

فجازاهم الله الکریم بفضله جنانا ورضوانا من الله ارفعا

الا ایها الاخوان صبرا فاننی اری الصبر للمقدور خیرا وانفعا

ولا تیاسوا من کشف ما ناب انه اذا شاء ربی کشف ذاك تموعا

درعیہ کی تباہی کے ساتھ (۱۲۳۴ھ / ۱۹۱۹ء) شیخ کے تربیت کردہ اور اصلاح یافتہ نجدکی

---

[۱] ابو البقا صالح بن شریف رندی کا مشہور مرثیہ جس کا مطلع یہ ہے:

لکل شیئ اذا ما تم نقصان فلا یغر بطیب العیش انسان

طلیطلہ کا سقوط صفر ۴۷۸ھ میں ہوا، عام طور پر لوگ سمجھتے ہیں کہ یہ سقوط غرناطہ (۷۹۲ھ) کا مرثیہ ہے۔ مگر صحیح یہی ہے کہ یہ سقوط غرناطہ سے تین سو برس پہلے کہا گیا تھا (نفح الطیب ج ۳ ص ۵۹۴)

[۲] زوال بغداد (۶۵۶ھ) کا مرثیہ جس کا مشہور مطلع یہ ہے:-

آسماں را حق بود گر خوں ببارد بر زمیں

بر زوال ملک مستعصم، امیر المؤمنین

[۳] عنوان ۲، ۳۴۔

سیاسی برتری ختم ہو جاتی ہے۔ نجد جدید[1] اور اس کی ترقی ہمارے دائرۂ بحث سے خارج ہے اس لیے نجدی حکومتوں کا قصہ چھوڑ کر ہمیں اب شیخ اور ان کے تصنیفات کی طرف متوجہ ہونا چاہیئے۔

ہاں اس سلسلے میں نجدی اور مصری لشکر کا باہمی فرق اور محمد علی اور ابراہیم پاشا کے مزاج و اخلاق کے متعلق بھی دو حرف عرض کر دیئے جائیں تو نامناسب نہ ہو۔

مصری فاتح

مصریوں اور نجدیوں کے درمیان عرصہ تک جنگ و پیکار کا سلسلہ جاری رہا۔ شروع شروع میں مصریوں کو کافی زک اٹھانا پڑی لیکن نجدیوں نے اسلامی قانون جنگ کی خلاف ورزی کبھی نہیں کی اور ان کی سپاہ کی شدت اور تقشف کے متعلق جو کچھ کہا جائے، پر اخلاقی کمزوریوں اور فسق و فجور کی مثالیں نہیں پیش کی جا سکتیں۔ رہے محمد علی اور ابراہیم اور ان کے ساتھی تو ان کے رویہ سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انہیں "اسلامیت" چھو بھی نہیں گئی تھی اور پتہ چلتا ہے کہ تیرھویں صدی ہجری

---

[1] نجد کی تاریخ کے تین دور ہو سکتے ہیں:۔

(۱) درعیہ کی سربلندی سے لے کر ۱۲۳۴ھ/۱۸۱۹ء تک جب کہ مصریوں کے حملوں اور درعیہ کی تباہی کے باعث ان کی قوت تتر بتر ہو گئی۔

(۲) ترکی بن عبد اللہ بن محمد بن سعود (۱۲۲۵ھ/۱۸۲۰ء تا ۱۲۴۹ھ/۱۸۳۴ء) اور فیصل بن ترکی (۱۲۴۹ھ/۱۸۳۴ء – ۱۲۵۴ھ/۱۸۳۸ء اور ۱۲۵۹ھ/۱۸۴۳ء تا ۱۲۸۲ھ/۱۸۶۵ء) کی بازیابی کی کوششوں سے شروع ہو کر ۱۳۱۴ھ/۱۸۹۶ء تک جب کہ محمد بن عبد اللہ آل الرشید (۱۲۸۵ھ/۱۸۶۹ء – ۱۳۱۵ھ/۱۸۹۷ء) امیر حائل نے حائل اور ریاض، نجد کی دونوں ریاستوں کو اپنے جھنڈے کے نیچے مجتمع کر لیا۔

(۳) تیسرا زرین دور (فلبی کی زبان میں "سیکنڈ وہابی امپائر") ۱۳۲۰ھ/۱۹۰۲ء سے شروع ہوتا ہے جب کہ موجودہ فرمانروا عبد العزیز بن عبد الرحمٰن بن فیصل بن ترکی بن عبد اللہ بن محمد سعود نے آل الرشید سے ریاض واپس لے لیا۔

کے آغاز میں عام طور پر مسلمان انحطاط کی کس حد تک پہنچ چکے تھے۔

نجدی اور مصری فوجوں کا باہمی فرق معلوم کرنے کے لیے مشہور معاصر مصری مورخ جبرتی کا مندرجہ ذیل بیان کافی ہوگا۔ محرم ۱۲۲۷ھ کے حوادث میں مصریوں کی شکست سے بحث کرتے ہوئے ایک مصری فوجی افسر (لقد قال لی بعض اکابرھم) کی زبانی لکھتا ہے:-

"ہمیں فتح کیسے نصیب ہو؟ ہماری فوج کا بڑا حصہ بے دین ہے، کسی آئین کی پابندی نہیں، جس کے جس مسکرات سے بھرے ہوئے ساتھ ہیں ہماری چھاؤنی میں اذان کی آواز سنائی نہیں دیتی۔ ان کے دلوں میں دین اور شعائر دین کا خیال بھی نہیں آتا اور یہ قوم (یعنی نجدی، عربی تعبیر و القوم ہے) وقت ہوتے ہی اذان دیتی ہے اور ایک امام کے پیچھے خشوع اور خضوع کے ساتھ صف بندی کرتی ہے۔ اگر جنگ کے دوران میں کہیں نماز کا وقت آگیا تو مؤذن اذان دیتا ہے اور سب نماز خوف پڑھتے ہیں۔ ایک جماعت جنگ کے لیے آگے بڑھتی ہے۔ پھر دوسرا گروہ نماز کے لیے پیچھے ہٹ جاتا ہے اور ہماری فوج حیرت سے منہ تکتی ہے، ان بے چاروں نے دیکھا تو درکنار سنا بھی نہیں[1]۔"

ہم اپنے قلم کو ان برائیوں کے تذکرے سے آلودہ کرنا نہیں چاہتے جو اس مصری فوجی افسر کے بیان کے مطابق مصری فوج نے بدر اور اس کے نواح میں روا رکھی تھیں۔ اتنا اشارہ کر دینا کافی ہوگا کہ اہل علم اور شرفاء کے گھروں کی بھی آبرو برقرار نہیں رہی تھی[2]۔

یہ تو ایک فوجی افسر کا بیان تھا۔ جبرتی کی اپنی روایت بھی ملاحظہ ہو۔ رمضان ۱۲۳۳ھ کے حوادث میں لکھتا ہے:-

"خشکی اور سمندر کی راہ سے فوجیں تین دفعات میں آگے پیچھے شعبان اور

---

[1] جبرتی: ۴، ۱۴۰۔ [2] ایضاً

رمضان کے مہینوں میں روانہ ہوئیں ...... اور ان لوگوں نے سفر کا عذر کر کے روزے نہیں رکھے ان کی تعداد بازاروں میں بیٹھ کر کھاتی پیتی ہے۔ (یہ لوگ) ہاتھوں میں تمباکو کا ناریل لیے ہوئے بے شرمی کے ساتھ سڑکوں پر گھومتے رہتے ہیں اور یہ اعتقاد رکھتے ہیں کہ اسلام کے مخالفوں اور کفار سے جہاد کرنے جا رہے ہیں[1]۔

جب دین اور دینی نظام کے احترام کا یہ عالم تھا تو پھر درعیہ کی بربادی اور نجد پر قبضہ کے بعد ابراہیم پاشا کا دماغ پھر گیا تو اس پر تعجب کیوں ہو، جبرتی فاتح نجد کی انانیت اور تجبر کا شاکی ہے:۔

"اس "غیبت" کے بعد ابراہیم پاشا اپنے کو بہت بڑا سمجھنے لگا ہے اور اس کے غرور کی کوئی حد نہ رہی، حتیٰ کہ جب علماء (مشائخ) اس کے پاس سلام کرنے اور تشریف آوری پر مبارکباد دینے گئے تو وہ ان کی تعظیم کے لیے کھڑا نہیں ہوا اور ان کے سلام کا جواب بھی نہیں دیا۔ آخر وہ لوگ بیٹھ گئے اور خیر و عافیت پر مبارکباد پیش کرنے لگے تو اس نے اشارہ سے بھی جواب نہیں دیا بلکہ ایک دوسرے شخص سے ہنسی مذاق کی باتیں کرتا رہا۔ وہ بیچارے رنجیدہ ہو کر لوٹ گئے[2]۔

کیا اس پر کسی اظہار رائے کی ضرورت ہے؟

محمد علی کی مکاری اور مظالم

محمد علی پاشا کے مظالم کو ہم یہاں دہرانا نہیں چاہتے۔ برک ہارٹ (جس نے محمد علی کے عہد حکومت میں حجاز اور جزیرۃ عرب کی سیاحت کی تھی اور جسے وہابیوں کے ساتھ کوئی خاص ہمدردی بھی نہیں) نے اس مظالم کی مفصل داستان لکھی ہے[3]۔ جو مستند اور قابل وثوق ہے، بعض مبصر ابراہیم کے غدر اور مکر و فریب کی ساری ذمہ داریاں محمد علی ہی کے سر ڈالتے ہیں:۔

جس بے رحمی اور دغابازی کا برتاؤ معزول بادشاہ اور عام وہابیوں کے

---

[1] ۴ : ۲۸۹۔ [2] جبرتی کے علاوہ ہوگارتھ (ص ۱۰۱) نے بھی ابراہیم پاشا کی "سیرت" کا نہایت اچھا خاکہ کھینچا ہے۔ [3] برک ہارٹ: ۳۵۲، ۳۲۳، ۳۱۸، ۲۴۲۔

ساتھ کیا گیا، اس کا الزام بھی ابراہیم سے زیادہ محمد علی کے سر عائد ہوتا ہے[1]۔

برک ہارٹ محمد علی کی رشوت ستانی کا بار بار ذکر کرتا ہے۔ اس کے بیان کے مطابق بدؤں رشوتیں دے کر محمد علی نے کامیابی حاصل کی۔

''مصریوں کی طرف بدوؤں کی ہمدردی مبذول کرنے میں رشوت کا بہت دخل تھا''

اس نے محمد علی کے مظالم اور بے رحمانہ قتل کی بھی کافی مثالیں دی ہیں۔ یہی سیاح ایک دوسری جگہ لکھتا ہے :۔

''محمد علی نے اپنے سپاہیوں کی طاقت سے زیادہ روپیہ کے ذریعہ عرب پر اپنی دھاک بٹھائی[2]۔''

ان کے مقابلہ میں نجدی وہابیوں کے بارے میں ایک عینی شاہد مشہور اسپینی سیاح بیدیا BADIA عرف علی بے عباسی کا بیان سنیے، جو نجدیوں کے قبضہ کے وقت مکہ مکرمہ میں موجود تھا۔

''جب تک وہ یہ نہ جان لیں کہ فلاں چیز دشمن یا مشرک کی ہے، اسے ہاتھ نہیں لگاتے اور زبردستی حاصل کرنے کی کوشش نہیں کرتے۔ وہ تمام چیزیں قیمت دے کر خریدتے ہیں۔ اسی طرح ہر خدمت کی اجرت ادا کرتے ہیں۔ اپنے سردار کے اندھے اطاعت شعار ہونے کی وجہ سے اس کے احکام کی تعمیل میں ہر مشقت برداشت کرنے کو تیار رہتے ہیں[3]۔''

علی بے سے بھی زیادہ محقق سیاح برک ہارٹ جو ۱۸۱۴ء میں (یعنی محمد علی کے قبضہ کے وقت) مکہ پہنچا تھا اور جس کی کتابیں اس کے صحت بیان اور وقت نظر کی شاہد ہیں لکھتا ہے :۔

''وہابی اقدام کی تہہ میں بری رسموں کے ختم کرنے کی زبردست مخلصانہ خواہش

---

[1] ہوگارتھ : ص ۱۰۳

[2] ہوگارتھ ص ۲۰۶ - ۲۰۲ - [3] ہوگارتھ : ۷۸ -

کام کر رہی تھی ۔ غدار سے غدار دشمنوں سے بھی انہوں نے وعدہ شکنی نہ کی ۔ اگر ترکوں (مصریوں) سے ان کے طرزِ عمل کا مقابلہ کیا جائے تو ہمیں ترکوں کی تمام وہ مہملات گننا پڑیں گی، جن میں وہ آلودہ ہیں۔[1]

برک ہارٹ کی پوری کتاب میں سعود اور عبد اللہ کے لیے تعریف[2] کے سوا کچھ نہیں۔

---

[1] ہوگارتھ : صفحہ ۹۷ [2] برک ہارٹ : ۲، ۱۸۰ - ۱۲۰

تیسرا باب

تصنیفات

حکیم مشرق اور جدید دنیائے اسلام کے پہلے سیاسی مفکر سید جمال الدین افغانی (ف ۱۳۱۵ھ / ۱۸۹۷ء) کے متعلق عصر حاضر کے مشہور عرب سیاست دان اور مجاہد امیر شکیب ارسلان (مولود سنہ) نے ایک جگہ کیا خوب لکھا ہے:۔[1]

"انہیں تصنیف و تالیف کی کثرت سے خاص دلچسپی نہیں تھی۔ وہ کتابوں کے مؤلف نہیں تھے بلکہ حکومتوں اور قوموں کے مصنف تھے"۔

شیخ الاسلامؒ کے متعلق بھی یہ فقرہ تھوڑی سی تبدیلی کے ساتھ دہرایا جا سکتا ہے، پھر بھی تبلیغ و دعوت کے سلسلہ میں شیخ نے جو لکھا وہ کچھ ایسا کم بھی نہیں ہے۔ نیز علمی لحاظ سے بھی اس کا پایہ بلند ہے۔ ان تحریروں میں متکلمانہ موشگافیاں اور یونانی علوم سے متاخرین فقہاء کی دور از کار باتیں نہیں ملیں گی۔ وہ ٹھیٹھ محدثانہ طریقہ پر لکھتے ہیں۔ جو بات کہی دوٹوک سیدھے سادھے الفاظ میں، کتاب و سنت کے نصوص سے آراستہ و پیراستہ اور بس، سچائی اور حقانیت کے پیکر کو ظاہری جمال و آرائش کی کیا ضرورت، سچائی اپنے اندر خود ایک نامعلوم کشش رکھتی ہے۔

ان کی تصنیفات کی بڑی خصوصیت یہ ہے کہ ان پر یونان اور یونانی علوم کی ہلکی سی پرچھائیں بھی نہیں پڑی۔ ہمارے ہاں ہندوستان کے بڑے سے بڑے مجدد دین امت کی کتابیں بھی یونانی گورکھ دھندے اور "اشراقیت" کے اثرات سے یکسر پاک نہ رہ سکیں، شیخؒ کا طریقہ بالکل

---

[1] حاضر العالم الاسلامی (۲: ۳۰۱) اصل عبارت یوں ہے:۔ "وبالجملة فانه لم یکن یحفل بوفرة التصانیف، وانما کان مؤلف امم ومصنف ممالک"۔

قرآنی ہے اور ان کی دلیلیں جزءً و کل، قرآن وحدیث سے ماخوذ ہوتی ہیں۔

دوسری بڑی خصوصیت یہ ہے کہ ان کے ہاں تصوف کی اصطلاحات بھی ناپید ہیں۔ ویدانت اور افلاطونی فلسفہ کے اس معجون مرکب نے (جس کا نام لوگوں نے تصوف[1] رکھ چھوڑا ہے) اسلام کی بنیادیں کھوکھلی کر ڈالیں۔ اسلامی ہند کے مجددین نے یہ بڑی غلطی کی کہ وہ اس افیون کا استعمال کراتے رہے، افیون، بہرحال افیون ہے، آپ اس کے لاکھ بدرقے استعمال کرائیں۔ اس کے برے اثرات بہرحال اعضائے رئیسہ کو تباہ کرتے جائیں گے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہندوستان کے مسلمان آج تک اس "مایا جال" سے نکل سکے لیکن شیخ الاسلام رح کے صحیح علاج اور اس افیون سے مکمل پرہیز کے باعث نجد اور نواح نجد کے مسلمان اس گورکھ دھندے سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے نکل گئے۔

جہاں تک شیخ کے طرز بیان کا تعلق ہے اس میں کوئی الجھاؤ نہیں، البتہ زبان انشاء امام ابن تیمیہ رح (م ۷۲۸ھ) ابن قیم رح (م ۷۵۶ھ) اور شاہ ولی اللہ رح (ف ۱۱۷۶ھ) کی طرح بہت بلند نہیں۔

لیکن ان کی تحریروں میں ایک دوسری انمول چیز ہے، جو پورے اسلامی لٹریچر میں خال خال نظر آتی ہے اور آٹھویں صدی ہجری کے بعد تو بالکل عنقا ہو گئی تھی۔ آپ اجازت دیں تو ہم اقبال رح

---

[1] بعض دوستوں نے یہ فرمائش کی ہے کہ تصوف کی مخالفت عمومیت کے ساتھ نہ کی جائے بلکہ جیسے علمائے سوء کے فقرے سے بے عمل علماء کی نشاندہی کی جاتی ہے، اسی طرح صوفیہ سوء کی اصطلاح مکار اور بدعت نواز صوفیوں کے لیے استعمال کی جائے ہمیں اس مشورہ کے قبول کرنے میں تامل نہ ہوتا اگر ہمارے سامنے "تصوف" کی تباہ کاریاں نہ ہوتیں۔ باقی وہ جس "احسان" اور اسلامی طریق تزکیہ کی دعوت دیتے ہیں، اس سے کس کافر کو اختلاف ہوگا، اختلاف اس غیر ماثور اصطلاح (تصوف) سے ہے، جس کے پردے میں دن دہاڑے دجل وفریب کا بازار گرم رہتا ہے اور اس فتنۂ عام سے بچنے کی یہی صورت ہے کہ اس لباس ہی کو اتار کر پھینک دیا جائے۔

کی زبان میں اسے "نفس" سے تعبیر کریں۔ ان کی ہر سطر تاثیر میں ڈوبی ہوئی نظر آتی ہے۔ شاید یہ اس دینی تڑپ کا اثر ہو، جس نے انہیں عمر بھر بے قرار رکھا۔ آخر ان میں کوئی چیز تو تھی، جس نے آن کی آن میں نجد اور اس کے نواح کی کایا پلٹ کر دی۔ خلاصہ یہ کہ ان کی چھوٹی بڑی تمام کتابوں اور خاص کر رسائل میں یہ تاثیر زیادہ محسوس ہوتی ہے۔

ہمیں شیخ کی حسبِ ذیل تالیفات کا علم ہو سکا ہے:۔

۱۔ کتاب التوحید۔ شیخ کی تصنیفات میں یہ رسالہ سب سے زیادہ مشہور ہے، جس طرح ہندوستان کے خوش فہموں میں مولانا اسماعیل شہیدؒ (ش: ۱۲۴۶ھ) کی "تقویۃ الایمان" بدنام ہے، اسی طرح عرب و عجم کے اکثر خوش عقیدہ لوگوں میں "کتاب التوحید" بھی اچھی نگاہ سے نہیں دیکھی جاتی۔ اس کا پورا نام "کتاب التوحید الذی ھو حق اللہ علی العباد" ہے۔ اس میں شیخ نے توحید کی حقیقت اس کے حدود، شرک اور اس کی خرابیاں اور اس میں ابتلاء کے تمام راستوں (استعاذہ، استغاثہ، توسل، دعا، نذر، ذبح، سحر، کہانت، فال وغیرہ وغیرہ) کو کھول کھول کر بیان کیا ہے، اپنی طرف سے بہت کم کہا ہے۔ ہر باب کے مطابق قرآن و حدیث کی صاف اور واضح شہادتیں جمع کر دی ہیں۔

یہ کتاب بہت مقبول ہوئی اور ہاتھوں ہاتھ لی گئی۔ بار بار ہزاروں کی تعداد میں طبع ہوئی، مختلف زبانوں میں ترجمے ہوئے اردو میں بھی کئی ترجمے ہو چکے ہیں۔ انگریزی ترجمہ کا اب تک پتہ نہیں چلا[1]۔

---

[1] انڈیا آفس کی عربی فہرست (۲: ص ۳۸۴: عدد ۲۰۵۰) میں کتاب التوحید کے انگریزی ترجمہ کا حوالہ دیا گیا ہے (جرنل رائل ایشیاٹک سوسائٹی: ۱۸۷۴ء) حالانکہ وہ شیخ عبداللہ بن محمد عبدالوہاب کے اس رسالہ کا وہ ترجمہ ہے جو انہوں نے ۱۲۱۸ھ میں فتح مکہ کے وقت تالیف کیا تھا، یہ شبہ بروکلمن کو بھی ہوا تھا (۲: ۳۹) لیکن ذیل (۲: ۵۳۲) میں اس نے تصحیح کر لی لیکن تصحیح کے بعد بھی سنہ کی غلطی رہ گئی۔ ۱۸۷۴ء کی جگہ ۱۸۴۰ء چھپ گیا ہے۔ شیخ عبداللہ کے رسالہ کا ترجمہ اوکنلی (O, KINELY) کے قلم سے ہے اور اس نے عجیب و غریب غلطیاں کی ہیں۔ کسی موقع پر ذکر آئے گا۔

علمائے نجد نے اس پر شرحیں بھی لکھی ہیں جن میں بعض بہت مفید اور پر مغز ہیں ، بروکلمن نے دو شرحوں کا ذکر کیا ہے[1] :-

(الف) "الدر النضیة" لاحمد بن حسن النجدی جو دلی میں طبع ہوئی (۱۳۱۱ھ)

(ب) "فتح اللہ الحمید المجید" مصنفہ حامد بن محمد بن حسن ، جو امرتسر میں چھپی (۱۸۹۷ء) پہلی کا ہمیں علم نہیں ہو سکا ۔ "دوسری شرح ادھوری اور معمولی ہے " لیکن بروکلمن نے سب سے اہم شرح "فتح المجید" کا ذکر نہیں کیا ۔ یہ اصل میں سلیمان بن عبد اللہ بن شیخ الاسلامؒ (مقتول ۱۲۳۳ھ) نے لکھنا شروع کی تھی لیکن نامکمل رہی ۔ تکمیل شیخ عبد الرحمٰن بن حسن شیخ الاسلامؒ (ف ۱۲۸۵ھ) نے کی اور کافی اضافے بھی کیے اور ہمارے سامنے جس شکل میں ہے ، وہ شیخ ابن حسن ہی کی ترتیب دی ہوئی ہے ۔ اس شرح میں تمام مسئلوں میں سیر حاصل بحث ہے ، جابجا امام ابن تیمیہؒ (ف ۷۲۸ھ) اور ابن قیمؒ کی کتابوں سے طویل اقتباسات دیئے ہیں اور اس طرح پر یہ شرح ایک جامع اور مفید کتاب ہو گئی ہے ۔

یہ پہلے مطبع انصاری دہلی میں چھپی تھی ۔ (۱۳۱۱ھ) دوبارہ مطبع سلفیہ مصر میں بحرین کے مشہور تاجر شیخ عبد الرحمٰن قصیبی کے صرفہ سے معمولی کاغذ پر چھپی (۱۳۴۷ھ) اور مفت تقسیم ہوئی ۔

اب تیسری مرتبہ مطبع انصار السُّنّۃ المحمدیہ ، قاہرہ میں شیخ محمد حامد الفقی کے اہتمام سے نہایت آب و تاب کے ساتھ چھپی ہے (۱۳۵۷ھ) آغاز میں محمد حامد الفقی نے مصنف کے حالات بھی دیئے ہیں جو "عنوان المجد" سے منقول ہیں ۔ ناشر نے جابجا احادیث کی تخریج بھی کی ہے ، نیز شرح میں جہاں جہاں امام ابن تیمیہؒ اور ابن قیمؒ کے اقوال بلا حوالہ نقل کیے گئے ہیں ، وہاں ناشر نے حاشیہ میں اصل کتابوں کا ٹھیک ٹھیک حوالہ دینے کی کوشش کی ہے ۔ اس سے مراجعت میں بڑی آسانی ہو گئی ہے ۔

شیخ عبد الرحمٰن بن حسن نے اس مفصل شرح (جو شیخ سلیمان بن عبد اللہ کی نامکمل شرح کی تکمیل ہے) کے علاوہ کتاب التوحید پر کچھ تعلیقات کرائے تھے ، وہ بھی الگ "قرۃ عین الموحدین" کے نام

---

[1] تاریخ ادب عربی (برمن) ذیل ۲ : ۲ ، ۵۳۱

چھپ گئے ہیں (مطبع المنار مصر ۱۳۴۶ھ) راقم کی نگاہ سے یہ کتاب نہیں گزری[۱۵]۔ محمد حامد الفقی نے "فتح المجید" کے حواشی میں کہیں کہیں اس کے اقتباسات دیئے ہیں۔

۲۔ "کشف الشبہات من التوحید"۔ اسے ہم "کتاب التوحید" کا تکملہ کہہ سکتے ہیں۔ یوں تو شیخ کی تمام کتابیں توحید سے متعلق ہیں اور "کتاب التوحید" کا تتمہ کہی جاسکتی ہیں۔ لیکن رسالہ "کشف الشبہات" میں توحید ہی توحید ہے، عام طور پر لوگوں کو توحید خالص کے متعلق جو شکوک ہوتے ہیں، ان کا ازالہ کیا گیا ہے۔ کسی کو ولی، غوث کا خیال آتا ہے، کوئی توسل اور استغاثہ کی راہ سے بھٹکتا ہے کہیں شفاعت میں غلط فہمیاں پیدا ہوتی ہیں۔ اس رسالہ میں ان سب شبہات کا قلع قمع کیا گیا ہے۔ انداز استدلال یکسر قرآنی ہے، کہیں ادنیٰ ابہام نہیں اور نہ متاخرین کے جدلیہ طرز بیان کا کہیں سایہ بھی پڑنے پایا ہے۔ ایک چھوٹا سا رسالہ معلومات اور فوائد کا گنجینہ ہے، بار بار چھپ چکا ہے، ہمارے سامنے وہ نسخہ ہے، جو عیسیٰ بن ربیح نجدی کے مجموعہ (ص ۲۷ - ۵۶) میں چھپا ہے۔

۳۔ "الاصول الثلاثہ وادلتہا": معرفت رب[۱]، معرفت دین اسلام[۲]، معرفت نبی[۳]۔ ان تینوں اصولوں کی دلنشیں انداز میں وضاحت کی گئی ہے۔ نہایت چھوٹا سا رسالہ ہے۔

۴۔ "شروط الصلاۃ وارکانہا" اس مختصر رسالے میں نماز کی شرطوں (اسلام[۱]، عقل[۲]، تمیز[۳]، رفع حدث[۴]، ازالت نجاست[۵]، ستر عورۃ[۶]، دخول وقت[۷]، استقبال قبلہ[۸] اور نیت[۹]) کی توضیح کی گئی ہے، نیز نماز کے ارکان اور واجبات بھی بیان کیے گئے ہیں۔

۵۔ "اربع قواعد" اس رسالہ میں بھی توحید کے بعض پہلو نہایت موثر اور سادہ طریقہ پر بیان کیے گئے ہیں۔ چار اہم قاعدے یہ ہیں:۔

(الف) کفار عرب بھی اللہ تعالےٰ کو "خالق، رزاق اور مدبر مانتے تھے لیکن اس سے وہ اسلام میں داخل نہ ہو سکے"۔

(ب) کفار عرب بھی اولیاء من دون اللہ کو قربت اور شفاعت ہی کے لیے پکارتے تھے۔

ویقولون ھٰؤلاء شفعاؤنا عند اللہ ۝

(ج) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے "ملائکہ، انبیاء، صالحین، اشجار، احجار، شمس، قمر" کی پرستش کرنے والوں سے یکساں قتال کیا اور مختلف قسم کے مشرکین کے درمیان کسی قسم کی تفریق روا نہیں رکھی۔

(د) اس زمانہ کے مشرک پہلے مشرکین سے گئے گزرے ہیں۔ وہ تو کم از کم مصیبتوں میں اللہ کو یاد کر لیا کرتے تھے اور موجودہ زمانہ کے مشرک ہر حال میں "اولیاء من دون اللہ" ہی کو پکارتے ہیں۔

اس مختصر رسالے میں انہیں چار قواعد کی آیاتِ قرآنی سے توضیح کی گئی ہے۔ یہ تینوں رسالے عیسیٰ بن رمیح نجدی کے طبع کرائے ہوئے مجموعہ میں ایک ساتھ چھپے ہیں۔ (ص ۱-۲۷) مطبع المنار قاہرہ ۱۳۴۰ھ نیز مجموعۃ الکتاب المفید" مطبوعہ مکہ مکرمہ (۱۳۴۳ھ) میں بھی یہ رسالے شامل ہیں۔

(۶) "اصول الایمان" - ایمان کے مختلف ابواب کی احادیث سے تشریح کی گئی ہے۔ آغاز کی عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ شیخ کے بعض فرزندوں نے اصل رسالہ میں کچھ اضافہ بھی کیا ہے۔ "وقد زاد فیہ بعض اولادہ زیادۃ حسنۃً"

پہلے دہلی میں چھپا تھا، اب مجموعۃ الحدیث النجدیہ (قاہرہ: مطبع المنار ۱۳۴۲ھ) کے ضمن میں طبع ہوا ہے۔ (ص ۲۴۰-۲۰۹)

(۷) "کتاب فضل الاسلام": - اسلام کے شرائط کی توضیح کے ساتھ ساتھ بدعت و شرک کی برائیاں کھول کر بیان کی گئی ہیں۔ (مجموعۃ الحدیث النجدیہ: ص ۵۵-۲۲۲)

(۸) "کتاب الکبائر" کبائر کے تمام اقسام الگ الگ ابواب کی صورت میں تفصیل کے ساتھ بیان ہوئے ہیں۔ ہر باب میں قرآن و حدیث کے نصوص سے توثیق کی گئی ہے۔ بلکہ مصنف نے اپنی طرف سے بہت کم لکھا ہے، قرآن کریم اور سنت نبویہ کا سلیقہ کے ساتھ جمع کر دینا اپنی جگہ پر

خود ایک کام ہے۔ (مجموعۃ الحدیث النجدیہ : ص ۳۱۰ - ۲۵۸)

(۹) نصیحۃ المسلمین ۔ یہ ایک مستقل کتاب ہے جس میں اسلامی تعلیم کے تمام شعبوں پر الگ الگ بابوں میں حدیثیں جمع کر دی گئی ہیں، مصنف نے اپنی طرف سے بہت کم بلکہ کچھ نہیں لکھا ہے (مجموعۃ الحدیث ص ۳۱۲-۴۴۴)

(۱۰) "ستۃ مواضع من السیرۃ" سیرت طیبہ کے چھ مقامات کی توضیح اور ان کے نکات پر چھوٹا سا رسالہ ہے ۔ وہ چھ مقام (ستۃ مواضع) یہ ہیں :

(الف) نزول وحی کی ابتداء ۔

(ب) تعلیم توحید اور کفار کا رویہ ۔

(ج) تلک الغرانیق العلی کا واقعہ ۔

(د) ابوطالب کا خاتمہ ۔

(ھ) ہجرت کے منافع اور ان سے سبق

(و) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد ارتداد کا واقعہ ۔

(مجموعۃ الکتاب المفید ص ۲۳ - ۱۹)

(۱۱) تفسیر الفاتحہ : سورۂ فاتحہ کی نہایت ہی مختصر تفسیر لیکن اس میں بھی شیخ کا جذبۂ توحید سطر سطر سے نمایاں ہے ۔ (مجموعۃ الکتاب المفید ص ۱۹ - ۱۸)

(۱۲) "مسائل الجاہلیۃ" : اس رسالہ میں شیخ الاسلامؒ نے ایسے ایک سو اکتیس مسئلے بیان کیے ہیں ۔ جن میں رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے اہل جاہلیت اور ان کے معتقدات کی مخالفت کی ہے ۔ محمود شکری آلوسی (ف ۱۳۴۲ھ) نے اس کی شرح بھی لکھی ہے (الزہراء : ص ۵۲ - ۴۴)

(۱۳) تفسیر الشہادۃ : کلمہ لا الٰہ الا اللہ کی تفسیر جس میں توحید کی اہمیت دلنشیں انداز میں واضح کی گئی ہے ۔ (〃 : ص ۸۰ - ۷۸)

(۱۴) تفسیر علی بعض سور القرآن[1] : مختلف آیتوں اور سورتوں پر شیخ الاسلامؒ کی تعلیقات کے

---

[1] فہرست مشروح اورنیٹل لائبریری ، پٹنہ : ج ۱۸ / ۱۲ ص ۱۴۷۷

مجموعہ کا نام ہے۔ ایک ایک آیت سے بیسیوں مسئلے استنباط کرتے جاتے ہیں۔ یہی اس کی خاص خصوصیت ہے۔

(۱۵) "کتاب السیرۃ"۔ یہ سیرت ابن ہشام کا خلاصہ ہے، پٹنہ لائبریری میں اس کا ایک بہت اچھا اور قدیم نسخہ ہے[1]۔

(۱۶) "الهدی النبوی"۔ امام ابن القیمؒ کی زاد المعاد کا اختصار ہے کتاب کے اوپر صرف "مختصر الهدی النبوی" لکھا ہوا ہے۔ اس کا ایک قلمی نسخہ پٹنہ[2] لائبریری میں ہے۔

ان کے علاوہ شیخ کے چھوٹے چھوٹے متعدد رسالے ہیں، جن کی تفصیل کی چنداں ضرورت نہیں معلوم ہوتی۔ بعض رسالے "روضۃ" اور اسی طرح بعض استفسارات کے جوابات بھی "روضۃ الافکار" میں درج[3] ہیں۔

---

[1] فہرست مشروح: ج ۱۵ ع ۱۰۳۸/۱

[2] فہرست مشروح: ج ۱۵ ع ۱۰۳۸/۲

[3] ج اول، فصل ثالث و رابع

چوتھا باب

دعوت

سیاست کی کارفرمائی

مصر جدید کے مشہور مصلح عالم اور سیّد جمال الدین افغانیؒ کے رفیق خاص، شیخ محمد عبدہؒ (ف ۱۳۲۳ھ/۱۹۰۵ء) سیاست اور اس کی بے انصافیوں سے پناہ مانگتے تھے۔ "مادخلت السیاسة فی شیئ الّا اَفسَدَته" ان کا مشہور فقرہ ہے ایک حد تک یہ سچ بھی ہے مقصد برآری کے لیے ارباب سیاست جائز اور ناجائز کا خیال نہیں کرتے اور اسی لئے صداقتوں کے مسخ کرنے میں وہ عارضی طور پر کامیاب ہو جاتے ہیں۔

شیخ الاسلامؒ کی دعوت جسے 'وہابیت' کے نام سے یاد کیا جاتا ہے، کوئی نئی چیز نہیں ہے کتاب و سنت کی صحیح تعلیم کے سوا وہ اور کچھ نہیں پیش کرتے لیکن سیاسی اغراض کے ماتحت شیخؒ کی دعوت کو وہابیت کا نام دے کر اس طرح پیش کیا گیا جسے اسلام کے علاوہ کسی دوسرے مذہب کی دعوت دی جا رہی ہو۔

سوء اتفاق سے اہل نجد کے بدنام کرنے میں تین جماعتیں شریک ہو گئیں، ترکی اور مصری حکومتوں سے تو براہِ راست ٹکر تھی اور جنگ و پیکار کا سلسلہ ایک عرصہ تک جاری رہا۔ حکومت ہند سے بھی ایک دو ٹکر ہو گئی تھی۔ اس لیے تینوں حکومتوں اور ان کے وظیفہ خواروں نے اس کارخیر میں نمایاں حصہ لیا۔ ان کے علاوہ اشراف مکہ اور ان کے حواری اپنے نذر و نیاز کی مذہبی[1] بندش پر الگ برہم تھے۔ نیز عام یورپی سیاح انگریزوں کے علاوہ بھی جزیرۃ العرب میں صحیح

[1] مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ میں قبروں اور قبوں کی آمدنیوں پر ایک بڑی جماعت کا گزارا تھا۔ ۱۲۱۸ھ میں سعودی قبضہ کے بعد ان کی روزی بند ہو گئی تو یہ دعوت کے مخالف بن گئے اور دور نزدیک طرح طرح

مذہبی بیداری کو اچھی آنکھوں سے نہیں دیکھ سکتے تھے ۔ خلاصہ یہ کہ مختلف اسباب کے ماتحت مختلف حکومتوں اور جماعتوں نے شیخ کی دعوت کی برائی اور بدنامی میں کوئی دقیقہ نہیں اٹھا رکھا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آج سے کچھ دنوں پہلے تک "وہابیت" نے ایک "ہوّے" کی شکل اختیار کر لی تھی۔ پھر ہندوستان میں حضرت سید احمد شہید بریلویؒ اور مولانا اسماعیل شہیدؒ دہلوی کی تحریک تجدید و امامت کو "وہابیت" کا نام دے کر اسے اسلام سے الگ ایک خارجی قسم کے مذہب[1] کی حیثیت دے دی گئی ۔

آج سے تیس چالیس برس پہلے، ان غلط الزامات کے قبول کرنے کی کوئی توجیہ کی جا سکتی تھی ۔ اہل نجد کی کتابیں عام طور پر نہیں ملتی تھیں اور خود علماء نجد اپنے محدود علاقہ سے باہر تبلیغ و اشاعت پر بہت کم توجہ کرتے تھے ۔ اس لیے اس وقت یہ بہت ممکن تھا کہ کوئی شخص سچائی کے ساتھ ان کے متعلق غلط رائے رکھتا ہو، لیکن آج کہ شیخؒ اور ان کے شاگردوں کی تصنیفات چھپ کر عام ہو چکی ہیں، لاعلمی کا عذر مسموع نہیں ہو سکتا۔

شیخؒ کا فقہی مسلک

مختصر طور پر تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ شیخ الاسلامؒ دین کو اس کی اصل شکل میں دیکھنا چاہتے تھے ۔ عقائد و اعمال ہر چیز میں سلف کی پیروی ان کے دل سے لگ گئی تھی ۔ فروع فقہ میں وہ امام اہل سنت احمد بن حنبلؒ (ف ۲۴۶ھ) کے مسلک پر عمل کرتے تھے ۔ لیکن حنابلہ کے مسلک کے خلاف کوئی حدیث مل جانے پر انہیں کوئی طاقت

(بقیہ حاشیہ ص ۱۲۶) کی غلط بیانیاں کرنے لگے ۔ جبرتی (۳ : ۲۵۵)، صفر ۱۲۱۸ھ کے حوادث میں لکھتا ہے:۔

"حاجیوں کے ساتھ اہل مکہ کی بڑی تعداد وہابیوں کے خوف سے بھاگ کر آئی ہے ۔ لوگ "وہابی" کے بارے میں طرح طرح کی باتیں کرتے ہیں، بعض اسے "خارجی" اور کافر بتاتے ہیں ۔ یہ رائے اہل مکہ اور ان کے پیرووں کی ہے اور بعضے بے غرضی کی وجہ سے ان کی رائے سے اختلاف رکھتے ہیں ۔" الخ

[1] مذہب: یہاں عربی مفہوم میں استعمال کر رہا ہوں، ھو ما ذھب الیہ احد الائمۃ اردو میں مذہب دین کا مرادف ہو گیا ہے ۔

اس حدیث پر عمل کرنے سے نہیں روک سکتی تھی :-

واما مذھبنا فمذھب الامام احمد بن حنبل امام اھل السنة فی الفروع ولاندعی الاجتھاد واذا بانت لنا سنة صحیحة عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عملنا بھا ولانقدم علیھا قول احدٍ کائنا من کان[1]۔

ہمارا مذہب فروع اور احکام میں امام اہل سنت امام احمد بن حنبلؒ کا مذہب ہے اور ہم اجتہاد کا دعویٰ نہیں کرتے اور جب رسول اللہ کی کوئی صحیح سنت ہم پر آشکارا ہوجاتی ہے تو ہم اس پر عمل کرتے ہیں اور اس پر کسی کا (خواہ کوئی بھی ہو) قول مقدم نہیں کرتے۔

امام ابن تیمیہؒ اور امام ابن قیمؒ کے اقوال سے وہ بسا اوقات استدلال کرتے ہیں، لیکن ان کی تقلید کا پھندا بھی شیخؒ نے گردن میں نہیں ڈالا، ابن تیمیہؒ اور ابن قیمؒ اسی وقت تک ان کے پیش رو ہیں، جب تک ان کے علم کے مطابق وہ کتاب وسنت سے منحرف نہیں ہوتے بلکہ وہ امام یا عالم ان کی نگاہ میں صرف اس لیے محبوب ہے کہ وہ کتاب وسنت پر صحیح صحیح عمل پیرا ہونے کی کوشش کرتا ہے۔

الامام ابن القیم وشیخہ اماما حق من اھل السنة وکتبھم عندنا من اعز الکتب الا اِنّا غیر مقلدین لھم فی کل مسئلة[2]۔

امام ابن القیمؒ اور ان کے استاد دونوں اہل سنت کے ائمہ حق میں سے ہیں اور ان کی کتابیں ہمیں بہت محبوب ہیں مگر یہ کہ ہر مسئلہ میں ہم ان کے مقلد نہیں۔

سچی بات یہ ہے کہ جہاں تک فقہ کا تعلق ہے وہ حنبلی مسلک کی اتباع کرتے ہوئے بھی دوسروں کو اس کی پیروی پر مجبور نہیں کرتے۔ وہ شافعی کو شافعی اور حنفی کو حنفی بننے کی دعوت دیتے ہیں۔ بدعات اور بیہودہ رسمیں کسی امام نے روا نہیں رکھیں۔ غنا اور مزامیر کے بارے میں فقہائے حنفیہ سے کون زیادہ سخت ہے، لیکن آج ہماری آنکھوں کے سامنے اپنے کو "حنفی" کہنے والے کیا کیا

[1] الھدیة السنیة: ص ۹۹۔ [2] الھدیة السنیة: ص ۵۳

نہیں کر رہے ہیں۔

شیخ کے فقہی مسلک کی مزید توضیح کے لیے ایک اور اقتباس ملاحظہ ہو:۔

ونحن ایضاً فی الفروع علی مذهب الامام احمد بن حنبل ولا ننکر علی من قلد احد الاربعة دون الغیر لعدم ضبط مذاهب الغیر کالرافضة الخ۔

(ہم بھی فروع میں امام احمد بن حنبلؒ کے مذہب[1] پر ہیں اور ائمہ اربعہ کے مقلدین پر نکیر نہیں کرتے البتہ ان کے علاوہ دوسروں کی تقلید روا نہیں رکھتے۔ اس لیے کہ اوروں کے مذاہب صحیح طور پر مدون نہیں، جیسے روافض وغیرہم)

ولا نستحق الاجتهاد المطلق ولا احد منا یدعیها الا اننا فی بعض المسائل اذا صح لنا نص جلی من کتاب او سنة غیر منسوخ ولا مخصص ولا معارض باقوی منه وقال به احد الائمة الاربعة اخذنا به وترکنا المذهب کارث الجد والاخوة فانا نقدم الجد وان خالف مذهب الحنابلة۔[2]

اور ہم "اجتہاد مطلق" کے اہل نہیں اور نہ ہم میں سے کوئی اس امر کا دعویٰ کرتا ہے۔ مگر یہ کہ بعض مسائل میں اگر کتاب یا سنت کی کوئی غیر منسوخ واضح نص سامنے آجائے جس کی تخصیص یا تعارض بھی کسی دوسرے قوی نص سے نہ ہو اور ائمہ اربعہ میں سے کسی نے اسے اختیار کیا ہو تو ہم اس پر عمل کرتے ہیں، جیسے جد اور بھائیوں (اخوۃ) کے ترکہ میں ہم حنابلہ کے مسلک کے خلاف جد کو اخوۃ پر مقدم رکھتے ہیں۔

---

[1] مارگولیوتھ نے شیخ الاسلامؒ اور امام احمد بن حنبلؒ کے اختلافات کی فہرست دی ہے جو انتہائی جاہلانہ ہے۔ مثال کے طور پر وہ لکھتا ہے کہ نماز باجماعت شیخ کے نزدیک فرض (OBLIGATORY) ہے اور امام کے ہاں نہیں۔ اس سے زیادہ جہل کا ثبوت اور کیا ہو سکتا ہے۔ (مقالۂ وہابیت: انسائیکلوپیڈیا آف اسلام)

[2] بحوالہ تاریخ نجد للآلوسی: ص ۴۶-۴۵، صیانۃ الانسان: ص ۱۷۱

عقائد

عقائد کے باب میں وہ "سلف" کے مسلک پر ہیں۔ قرآن کریم اور صحیح حدیثوں میں اللہ تعالیٰ کی جو صفتیں آئی ہیں انہیں ہوبہو تسلیم کرنا اور "کیفیت" کی نفی کے ساتھ ان کے ظاہر پر ایمان لانا یہی سلف کا مسلک ہے۔

صفات کا مسئلہ علماءِ اسلام کے درمیان مختلف فیہ رہا ہے۔ ایک جماعت "تشبہ" اور "تمثیل" کے خوف سے "صفات" ہی کا انکار کر بیٹھی۔ یہ گویا اللہ کو معطل کر دینا ہوا۔ دوسری جماعت صفات کی قائل ہوئی تو "تشبیہ" اور "تکییف" کی حد تک آگئی۔ یہ بھی حد سے تجاوز کرنا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی ذات "جسمیت" سے منزہ ہے۔ متکلمین اشاعرہ نے اس "تعطل" اور "تشبہ" سے بچنے کے لیے ان تمام آیتوں اور حدیثوں کی تاویل شروع کر دی۔ وہ "استوا" سے "استیلا" مراد لینے لگے۔ اسی طرح (ید اللہ) کی تفسیر "نعمت" اور "قدرت" سے کرنے لگے۔ (فانک بأعیننا) سے حفظ و نگہداشت کے معنیٰ لیے گئے الخ لیکن سلف اور ان کے نقشِ قدم پر چلنے والے اس تاویل سے اتفاق نہیں کرتے۔ یہ کہاں سے معلوم ہوا کہ ان الفاظ سے جو آپ مراد لے رہے ہیں وہی مرادِ الٰہی بھی ہے؟ اور پھر تاویل کرنے والوں کو بعض آیتوں اور حدیثوں کی تاویل میں ایسی دور از کار تاویلیں کرنا پڑتی ہیں کہ پڑھ کر بے اختیار ہنسی آتی ہے۔ ابن فورک (ف سنہ ۴۰۶ھ) کی "مشکل الحدیث" میں اس "کوہ کندن و کاہ برآوردن" کی بے شمار مثالیں مل سکتی ہیں۔ سلف کا مسلک اس "تکییف و تعطیل او تاویل" سے الگ ہے۔ ائمہ سلف کا مسلک امام ابن تیمیہؒ کی زبان میں یوں بیان کیا جاتا ہے۔

"ائمہ سلف کا مذہب یہ ہے کہ ہم اللہ کو تحریف، تعطیل، تکییف، تمثیل کا ادنیٰ شائبہ آئے ہوئے بغیر ان صفتوں کے ساتھ متصف کر دیں، جن کے ساتھ خود اس نے اپنے کو اور اس کے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے متصف کیا ہے، تو ان صفات کی نفی جائز نہیں، جن سے اس نے اپنے کو متصف کیا ہے اور نہ ان صفات کو مخلوق کی صفتوں کے ساتھ تشبیہ دی جا سکتی ہے بلکہ اس کی ذات ان چیزوں سے منزہ ہے، اس کا مثل کوئی نہیں۔ نہ ذات میں نہ صفات میں نہ افعال میں۔ تو

سلف کا مذہب دو مذہبوں کے بین بین اور دو گمراہیوں کے درمیان اعتدال کی راہ ہے۔ یعنی صفات کا اثبات اور مخلوقات کے ساتھ مماثلت کی نفی[1] الخ

تو گویا سلف کا مسلک اثبات اور نفی کے درمیان ہوا۔ وہ ید۔ عین اور اس قسم کی دوسری صفتوں کی تاویل نہیں کرتے بلکہ ان کے ظاہر ہی پر ایمان لاتے ہیں۔ لیکن مماثلت کی نفی کے ساتھ "ید" اور "عین" سے صفات باری میں وہ معنی نہیں سمجھے جائیں گے جو انسانوں کے ساتھ سمجھے جاتے ہیں، اس لیے اللہ تعالیٰ کیف اور جسمیت سے منزہ ہے۔ اصل مفہوم اور کیف کا علم صرف اللہ تعالیٰ کو ہے، ہمارا کام بے چون وچرا ایمان لانا ہے، امام دار الھجرۃ مالک ابن انس رح کا مشہور مقولہ مسلک سلف کا بہترین ترجمان ہے۔

الاستواء غیر مجہول والکیف غیر معقول والایمان بہ واجب والسؤال عنہ بدعۃ۔	استواء نامعلوم نہیں اور کیف کا تصور اللہ تعالیٰ کی ذات کے ساتھ نہیں کیا جاسکتا اور اس پر ایمان لانا واجب ہے اور اس کے متعلق کرید نا بدعت[2] ہے۔

یہ سلف کا مسلک صرف حنابلہ یا امام ابن تیمیہ رح اور شیخ محمد بن عبد الوہاب رح کا نہیں بلکہ تمام ائمہ اسلام کا یہی مسلک رہا ہے۔ "تشبیہ اور تجسم" کی نفی کے ساتھ تاویل سے بچنا (الامساك عن التاویل مطلقاً مع نفی التشبیہ والتجسیم)، تمام ائمہ کا مسلک رہا ہے۔ امام ابو حنیفہ رح، امام مالک رح۔ امام شافعی، امام احمد رح، محمد بن الحسین رح، سعد بن معاذ مروزی رح، عبد اللہ بن المبارک رح، سفیان ثوری رح، امام بخاری رح، ترمذی رح، ابو داؤد سجستانی رح وغیرہم سب اسی مسلک پر گامزن رہے ہیں[3]۔

خود امام ابو الحسن اشعری سے رجوع ثابت ہے۔ امام الحرمین سے بھی اس کی تائید منقول ہے تمام صحابہ اور تابعین کا تو یہ مسلک تھا ہی، تاویل کا دروازہ تو "عقلیت" کی گرم بازاری کے بعد کھلا۔

---

[1] جلاء العینین: ص ۲۱۲ - [2] ایضاً: ص ۲۲۹ - [3] انتقاد الرجیح (علی حاشیۃ جلاء العینین)، ص ۲۰۳

متاخرین اشاعرہ اور عام علمائے اسلام (متاخرین) کا مسلک، تأویل کا رہا ہے، مدرسوں میں عقائد کے نام سے جو کچھ پڑھایا جاتا ہے، وہ یہی اہل تأویل کا مسلک ہے لیکن تأویل کے وہ معنیٰ تو ان الفاظ کا ایک محمل ہے، ایسی بیسیوں تأویلیں اور بھی کی جا سکتی ہیں، یہ کہاں سے ثابت ہو گیا کہ آپ کی تأویل عین مرادِ الٰہی کے مطابق ہے اور اگر اس کا یقین نہیں (اور یقینی نہیں) تو ہم پھر اپنے کو خطرہ میں کیوں ڈالیں؟ سلامتی اسی میں ہے کہ اسلاف کے طریقہ کے مطابق ہم بھی (کل ماورد فی الشرع) پر بلا تعطیل و تکیف کے اعتقاد رکھیں، یہی پہلے بزرگوں کا مسلک ہے اور اسی پر آج بھی ٹھیٹھ اہل توحید و سنت اعتقاد رکھتے ہیں، شیخ الاسلام محمد بن عبد الوہابؒ اور ان کے پیرووں کا بھی یہی عقیدہ ہے :-

..... وبالجملة فعقيدتنا فى جميع الصفات الثابتة فى الكتاب والسنة عقيدة اهل السنة والجماعة نؤمن بها و نمر بها كما جاءت مع اثبات حقائقها و مادلت عليه من غير تكييف ولا تمثيل ومن غير تعطيل ولا تبديل ولا تأويل[1] الخ

خلاصہ یہ کہ ان تمام صفات کے بارے میں جو کتاب و سنت میں ثابت ہیں، ہمارا عقیدہ اہلِ سنت والجماعت کا عقیدہ ہے، ہم ان پر ایمان رکھتے ہیں اور زیادہ کرید نے کی کوشش نہیں کرتے۔ اور ان کے معانی و حقائق پر اعتقاد رکھتے ہیں لیکن کسی تکیف تمثیل یا تعطیل و تبدیل اور تأویل کی پرچھائیں بھی نہیں پڑنے دیتے۔ الخ

آیاتِ صفات کے باب میں سلف کا مسلک مشہور ہے (جس کی مختصر توضیح اوپر کی گئی) صرف اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ شیخ الاسلامؒ بھی سلف کا عقیدہ رکھتے تھے۔ قرونِ اولیٰ کے بعد امام ابن تیمیہؒ (ف ۷۲۸ھ) سے زیادہ کسی نے اس سلسلہ میں تکلیفیں نہیں اٹھائیں۔ اشاعرہ اور متکلمین کے خیالات ذہن اور دماغ پر کچھ اس طرح مسلط ہو گئے تھے کہ راہِ حق بھی لوگوں کو جاہلوں اور کم عقلوں کا مسلک نظر آتی تھی۔

---

[1] الهدية السنية: ص ۹۹

بہرحال امام ابن تیمیہؒ کی طرح شیخ الاسلام ابن عبد الوہابؒ بھی سلف کے عقیدے پر سختی کے ساتھ قائم رہے، اس مسئلہ کی تفصیل کے لیے آلوسی کی "جلاء[1] العینین فی محاکمۃ الاحمدین" ملاحظہ کی جاسکتی ہے جہاں فاضل مصنف نے پوری بحث کا نچوڑ دے دیا ہے ابن تیمیہؒ، ابن جوزیؒ (ف ۶۴۴ھ)، شیخ عبد القادر جیلیؒ ۵۶۵ھ اور خود امام ابوالحسن اشعریؒ (ف تقریباً ۳۳۴ھ) کی تصنیفات سے اقتباسات دیئے ہیں۔

توحید اور اس کے لوازم

شیخؒ نے اپنی تمام کتابوں اور رسائل میں توحید پر بہت زور دیا ہے بلکہ یہ کہنا صحیح ہے کہ ان کی تصنیفات میں صرف توحید ہی توحید ہے۔ ان کی دعوت بھی توحید کی تھی، شعار کلمہ لا الٰہ الا اللہ تھا۔ وہ ہر ایک کو اسی کلمہ کا مفہوم سمجھاتے اور اس کی حقیقت ذہن نشین کرانے کی کوشش کرتے۔ اسی لیے ان کے ماننے والے بسا اوقات، موحدین کے نام سے بھی پکارے جاتے ہیں۔

توحید کیا ہے؟ صرف اللہ تعالیٰ کو عبادت کا مستحق قرار دینا۔ بات معمولی سی ہے لیکن شیطان کی گھاتیں بہت وسیع ہیں، اس نے ایک اللہ کے پرستاروں سے بھی وہ کام کرائے، جو شرک کے حدود میں داخل ہوتے ہیں۔ اخلاص توحید کے لیے ضروری ہے کہ ان تمام اعمال و اقوال سے پرہیز کیا جائے، جن میں غیر اللہ کی شرکت کا ادنیٰ شائبہ بھی پیدا ہوتا ہو۔ شیخ الاسلامؒ نے ان اعمال و اقوال کی توضیح میں کوئی کمی نہیں کی۔ ان کے مضرات اور برائیاں کھول کھول کر بیان کیں، جن راہوں سے یہ برائیاں پیدا ہوتی تھیں۔ ان کے روکنے کی کوششیں کیں لیکن وہ قوم جو سارے عالم کے لیے توحید کا پیغام لے کر نکلی تھی، بعد کی صدیوں میں خود قبر پرستی، تعزیہ پرستی اور اس قسم کی دوسری "پرستیوں" کا اس طرح شکار ہوئی کہ جب ایک عرصہ کے بعد اس کے کانوں میں توحید کی آواز پہنچی تو اسے اجنبیت محسوس ہونے لگی۔ کتاب و سنت سے نصوص پیش کیے گئے تو تاویلیں کی گئیں اور خود توحید کے علمبرداروں کو وہابی، مشرک، خارجی اور مختلف فقہی اور مذہبی گالیوں سے نوازا گیا۔ شیخ الاسلامؒ

---

[1] الهدية السنية: ص ٢٦٠ - ص ١٦١ -

کا سارا قصور یہ ہے کہ انہوں نے کھلم کھلا توحید کی دعوت دی۔ شرک اور اس کی آلودگیوں سے بچنے کی تاکید کی، اوثان من دون اللہ کی مذمت کی۔ غیر اللہ کی قسمیں کھانا، نذریں ماننا اور قبروں کی پرستش کی صاف صاف برائی کی اور اگر یہ واقعی قصور ہے تو پھر ہر مسلمان کو سچے دل سے قصوروار بن جانا چاہیئے۔

ذیل میں ہم ان مخصوص باتوں کو سادہ لفظوں میں بیان کر دیتے ہیں جو شیخؒ اور اہل سنت کی رائے اور عقیدہ میں توحید سے دور اور شرک سے قریب کرنے والی ہیں:۔

(۱) مصیبتوں میں غیر اللہ کو پکارنا یا اللہ کے ساتھ غیر کو بھی پکارنا: اب جو عام طور پر لکھے پڑھے یا پڑھے لکھے خوش عقیدہ یا رفاعی یا بدوی اور "یا عبد القادر" (اور ہمارے ہاں: اے داتا پیر بہوڑ، اے مخدوم صاحب منجھن وغیرہ وغیرہ) کہہ کر غیر اللہ کو مصیبتوں میں یاد کرتے ہیں۔ تو یہ "دعا غیر اللہ" شائبہ شرک سے خالی نہیں۔ اس "دعا" میں عبادت کی جھلک آتی ہے۔ "داعی" کی نیت اور "مدعو" کے مرتبہ سے بالکل بحث نہیں۔ ممکن ہے اور بہت ممکن ہے کہ "داعی" کی نیت، عبادت یا شرک کی نہ ہو۔ لیکن ایک مخلوق دوسرے مخلوق کو مصیبتوں میں پکارے، اس سے دفع ضرر یا جلب خیر کی درخواست کرے، یہ توحید کے سراسر خلاف ہے اور اسلام جیسے دین کامل میں اس کی بالکل گنجائش نہیں۔

ان حالات میں جو غیر اللہ کو مصیبتوں میں یاد کرتا ہے۔ اس کی دو صورتیں ہیں یا تو وہ جاہل ہے اور کتاب و سنت کی صحیح تعلیمات کا اسے علم نہیں تو اسے شیخ الاسلامؒ کے پیرو سیدھی راہ بتانے کی کوشش کریں گے کہ وہ آئندہ اس سے پرہیز کرے اور اگر کوئی شریعت کا حکم جاننے کے بعد بھی دفع ضرر یا جلب خیر کے لیے غیر اللہ کو یاد کرتا ہے تو پھر وہ اسے مشرک سمجھتے ہیں اور اس سے کسی قسم کی رواداری برتنے کے لیے تیار نہیں۔ قرآن کریم کی یہ آیتیں ان کے لیے حجت اور دلیلِ راہ ہیں:۔

وَالَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ مَا يَمْلِكُوْنَ مِنْ قِطْمِيْرٍ۔ اِنْ تَدْعُوْهُمْ لَا

یَسْمَعُوْا دُعَاءَكُمْ وَلَوْ سَمِعُوْا مَا اسْتَجَابُوْا لَكُمْ وَيَوْمَ الْقِيَامَةِ يَكْفُرُوْنَ بِشِرْكِكُمْ وَلَا يُنَبِّئُكَ مِثْلُ خَبِيْرٍ[1] (۳۵ : ۱۴، ۱۵)

(۲) استغاثہ: غیر اللہ سے فریاد چاہنا، اس کا حکم بھی دعاء غیر اللہ کا ہے۔

ابو یزید بسطامی کا قول ہے۔ استغاثۃ المخلوق بالمخلوق کاستغاثۃ المسجون بالمسجون۔

مخلوق کا مخلوق سے فریاد چاہنا، اس کی مثال ایسے ہی ہے کہ ایک قیدی دوسرے قیدی سے فریاد طلب کرے۔

طبرانی کی روایت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ہے:۔

"انہ لا یستغاث بی و انما یستغاث باللہ تعالیٰ"[2]

خلاصہ یہ ہے کہ زندہ یا مردہ کسی غیر اللہ سے فریاد چاہنا قطعاً حرام ہے اور اسلامی توحید کے بالکل خلاف ہے۔

(۳) توسل: لفظ توسل تین معنوں میں استعمال کیا جاتا ہے:۔

(الف) رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کا وسیلہ تو یہ فرض ہے۔ اس کے بغیر ایمان مکمل ہو ہی نہیں سکتا۔

(ب) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا اور شفاعت کا وسیلہ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں تھا اور پھر قیامت کے دن اس کا موقع ہوگا، جب خلقت رسول کی شفاعت کا وسیلہ ڈھونڈے گی۔

(ج) تیسرا وہ توسل ہے جس میں اللہ تعالیٰ کو انبیا اور صالحین کی ذات کا واسطہ دلایا جاتا ہے تو یہ صحابہ نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں کیا نہ وفات کے بعد نہ استسقاء وغیرہ کے موقع پر، نہ قبر پر اور نہ قبر سے ہٹ کر کسی موقع پر صحابہ سے اس قسم کا غیر مشروع توسل منقول نہیں جس میں اللہ تعالےٰ کو گویا رسول یا ولی کی ذات کی قسم دی جاتی ہے۔ ادعیہ ماثورہ میں بھی کہیں اس توسل

---

[1] جلاء العینین: ص ۲۱۲ [2] بحوالہ جلاء العینین ص ۳۱۳

کا پتہ نہیں چلتا، توسل کی یہی تین صورتیں ہیں جن میں سے پہلی صورت (یعنے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان اور ان کی اطاعت کا وسیلہ پکڑنا) ہمیشہ مشروع ہے۔ دوسری صورت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا اور شفاعت کو (ذات کو نہیں) وسیلہ بنانا کو یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں بلاشبہ نافع اور مطلوب تھا توسل کے ان دونوں معنوں کا منکر کافر اور مرتد ہے"۔

(من انکر التوسل باحد هذین فهو کافر مرتد) جیسا کہ امام ابن تیمیہ رح نے تصریح کی ہے لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد یہ دوسری صورت بھی متعذر ہو گئی، قبروں پر سلام اور اہل قبر سے مخاطب ہو کر السلام علیکم کہنا منقول ہے، لیکن مردہ یا غائب سے دعا کی درخواست کرنا بدعت ہے[1] یہی وجہ ہے کہ حضرت عمر بن خطاب رض نے صحابہ کرام (رضوان اللہ علیہم اجمعین) کے بھرے مجمع میں ارشاد فرمایا (اور کسی نے نکیر نہیں کی)[2]

اللّٰهم انا کنا اذا اجدبنا توسلنا الیك نبیّنا فتسقینا و انا نتوسل الیك بعم نبیّنا فاسقنا ۵ ۔	اے اللہ جب ہم پر قحط سالی آتی تھی تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا وسیلہ پکڑتے تھے اور تو ہمیں سیراب کرتا تھا اور (اب) ہم نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا کا وسیلہ پکڑتے ہیں تو ہمیں سیراب کر۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رحلت کے بعد حضرت عباس رض کا وسیلہ پکڑنا بے معنی بات نہیں ہو سکتی۔ چونکہ یہ توسل طلبِ دعا کے لیے ہوتا ہے اور وفات کے بعد طلب دعا متعذر ہے۔ اس لیے حضرت فاروق رض عم رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کا وسیلہ لائے۔ (یعنے طلب دعا کے لیے)

اب رہی تیسری صورت جس میں انبیاء اور صالحین کی ذات کو وسیلہ بنایا جاتا ہے یا اللہ تعالیٰ کو اولیاء اور صالحین کے نام کی قسم دی جائے۔ جیسے کوئی کہے:۔

"اسألك بجاه عبدك او بحرمته"

تو اس میں علماء کا اختلاف ہے، حنابلہ کے نزدیک صحیح روایت میں مکروہ تحریمی ہے۔

---

[1] جلاء العینین: ص ۲۸۴ ۔ [2] مشکوٰۃ المصابیح: باب الاستسقاء۔

لاحق للمخلوق علی الخالق سے ان کا استدلال ہے اور صحیح معلوم ہوتا ہے۔ یہی امام ابن تیمیہؒ کا مسلک ہے اور اسی پر شیخ الاسلام محمد بن عبد الوہابؒ اور ان کے متبعین کا عمل ہے، وہ کسی نبی یا ولی کی ذات کے ساتھ توسل کو روا نہیں رکھتے اور اگر وہ ایسا کرتے ہیں تو کوئی نئی بات نہیں کرتے۔ صرف حنفیہ اور حنابلہ کے متفقہ مسلک کو عملی جامہ پہناتے ہیں۔

متقدمین محقق علماء میں شیخ عز الدین بن عبد السلامؒ (ف ۶۶۰ھ) صرف رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ اقدس سے توسل کو جائز[1] قرار دیتے ہیں یعنی ان کے نزدیک اللھم انی اتوسل الیک نبیک وحبیبک محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) یا اللھم انی اسئلک بجاہ صفیک ونبیک محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کہنا جائز ہے۔ رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کی ذات اقدس اور ان کے بلند مرتبہ کو سامنے رکھتے ہوئے شیخ عز الدین بن عبد السلامؒ جیسے مجتہد النظر عالم تک ڈگمگا جانا کوئی حیرت کی بات نہیں۔ متاخرین میں شوکانیؒ (ف ۱۲۵۰ھ) بھی توسل بالنبی کو جائز رکھتے ہیں۔ رہا اولیا اور صالحین کی ذات کو وسیلہ بنانا، تو یہ کسی سے منقول نہیں اور اگر بعض متاخرین[2] علماء نے اس کے جواز کی کوشش کی ہے، تو یہ ایک بے اصل اور مشتبہ بات کے رائج کرنے کی کوشش ہے اور اس سے خواہ مخواہ بدعات کا دروازہ کھلتا ہے۔

یہاں صرف شیخ الاسلامؒ کے مسلک کی توضیح مقصود ہے۔ کسی فقہی بحث کا یہ موقع نہیں۔ ماخذ کے ضمن میں موضوع کی مختلف کتابوں کا ذکر آئے گا۔ "التوسل والوسیلۃ" کے علاوہ امام ابن تیمیہؒ کے "فتاویٰ" اور دوسری تصنیفات بھی ان بحثوں سے بھری پڑی ہیں۔ مختصر طور پر موافق و مخالف بحثوں کے خلاصہ کے لیے "جلاء العینین" (ص ۳۱۵ - ۲۶۹) سے فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔

---

[1] وہ بھی "ان صح الحدیث فیہ" کی شرط کے ساتھ (الدر النضید ص ۶)

[2] ہندوستان میں مولانا اسماعیل شہیدؒ (ش ۱۲۴۶ھ) اور اکثر علمائے دیوبند اولیاء اور صالحین کی ذات سے توسل کو جائز کہتے ہیں۔ لیکن راقم کا ذہن اس کے قبول کرنے سے ابا کرتا ہے۔

(۴) استعاذہ : توحید کا اقتضا یہ بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کے اسمار اور صفات کے سوا کسی مخلوق کی پناہ بھی نہ ڈھونڈی جائے۔ اسی اصل کی بنار پر امام اہل سنت احمد بن حنبلؒ نے قرآن کے کلام الٰہی اور غیر مخلوق (کلام اللہ غیر مخلوق) ہونے پر اس حدیث سے استدلال کیا تھا۔

"اعوذ بکلمات اللہ التامات"

یعنی اگر اللہ کا کلام مخلوق ہوتا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کلمات اللہ یعنی مخلوق کی پناہ نہ مانگتے گویا اس وقت یہ بات مسلم تھی کہ مخلوق کے ساتھ استعاذہ (یعنی کسی مخلوق کی پناہ مانگنا) جائز نہیں ورنہ مخالفین ضرور تردید کرتے۔ خود قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے کاہنوں کی مذمت کی ہے کہ وہ غیر اللہ (جن) کی پناہ مانگتے ہیں:

اَنَّهٗ كَانَ رِجَالٌ مِّنَ الْاِنْسِ يَعُوْذُوْنَ بِرِجَالٍ مِّنَ الْجِنِّ فَزَادُوْهُمْ رَهَقًا ۝

(۷۲ : ۶)

اسی لیے شیخ الاسلامؒ نے صاحب "بردہ" کے اس شعر پر اعتراض کیا ہے :-

یا اکرم الخلق مالی من الوذ بہ سواك عند حلول الحادث الجسم

کوئی شک نہیں کہ "مالی من الوذ بہ سواك" (میرے لیے تیرے سوا کوئی نہیں جس کی پناہ لوں) صرف اللہ تعالیٰ کی شان ہو سکتی ہے۔ شوکانیؒ نے بھی (جو توسل کے مسئلے میں ذرا نرم ہیں) اس شعر پر اعتراض کیا ہے[1]۔

(۵) الحلف بغیر اللہ :- غیر اللہ کی قسم کھانا بھی توحید کی روح کے خلاف ہے۔ یہ کوئی مختلف فیہ مسئلہ نہیں بلکہ اس پر تمام علمار کا اتفاق ہے۔ لیکن عوام بلکہ خواص بھی اس آزار میں مبتلا ہیں اور تمام مسلم علاقوں میں انبیار اور اولیار کی قسمیں کھانے کا عام رواج ہے، اتنا عام کہ اگر آپ کسی کو منع کریں تو ماننے کے بدلے الٹا آپ پر بددینی یا کم از کم "وہابیت" کا الزام تو لگا ہی دے گا۔ حالانکہ ترمذی کی روایت "من حلف بغیر اللہ فقد اشرك" میں حلف بغیر اللہ کو شرک کہا

---

[1] الدر النضید : ص ۲۹

گیا ہے۔ اس سے زیادہ نہی، اور کیا ہوسکتی ہے؟ اسی اصل کی بنا پر امام ابوحنیفہؒ نے فرمایا:-

"لاینبغی لاحد ان یدعو اللہ الا بہ واکرہ ان یقول بمعاقد العز من عرشك اوبحق خلقك"

تو امام اعظمؒ کے نزدیک اللہ کے سوا غیر اللہ کی قسم کھانا یا اس کی دہائی دینا قطعاً ممنوع ہے البتہ امام ابویوسف "بمعاقد العز من عرشك" جائز رکھتے ہیں کہ عرش پر عزت کی جگہ کا مالک اللہ ہی ہے اور "معقد العز من عرشك" سے اللہ تعالیٰ ہی مراد ہوسکتا ہے۔ امام صاحبؒ اس کو بھی مکروہ سمجھتے ہیں۔ "بحق فلاں" کہہ کر اللہ سے مانگنا تو بہرحال سب کے نزدیک مکروہ تحریمی ہے، جیساکہ اوپر گزر چکا — دعاء غیر اللہ، استغاثہ بغیر اللہ، التوسل بالانبیاء والصالحین، استعاذہ اور حلف بغیر اللہ یہ سب کی سب ایک قسم کی چیزیں ہیں، ان میں سے ہر ایک اپنے اندر شرک کے جراثیم رکھتی ہے اور توحید کی روح کے یکسر خلاف۔ اس لیے یہ توہم پرستیاں دین خالص میں کبھی روا نہیں رکھی جاسکتیں۔ محمد بن عبدالوہابؒ کا قصور صرف اس قدر ہے کہ انہوں نے ان "مکروہات" سے سختی کے ساتھ روکا اور کم از کم ایک خطہ میں عوام تک کو اس کا پابند کر چھوڑا۔

(۶) زیارۃ القبور:- قبروں کی زیارت مشروع ہونے میں شک نہیں، بشرطیکہ زیارت کے حدود سے تجاوز نہ کیا جائے۔ مسلمان کے لیے انبیاء، صالحین، عام مسلمانوں بلکہ غیر مسلموں کی قبروں کی زیارت بھی جائز ہے۔ اُس کے لیے جو عبرت اور نصیحت حاصل کرنا چاہے اور مسلمانوں کی قبروں کی زیارت سنت ہے (جس کی ترغیب بھی دی گئی ہے) اس کے لیے جو اہل قبر کے لیے دعا کرنا چاہے۔

محمد بن عبدالوہابؒ اور ان کے ماننے والے زیارت قبور کے منکر نہیں، البتہ وہ ان بدعات کے سخت مخالف ہیں جو قبروں کے پاس روا رکھی جاتی ہیں، وہ "قبروں سے مرادیں مانگنے والوں اور شفاعت چاہنے والوں" کو روکتے ہیں اور آج کل قبروں کی زیارت نہیں ہوتی بلکہ "بدعت فروشی"

کی دوکانیں گرم ہوتی ہیں، صاحب قبر سے دعا مانگنا، اس کے واسطہ سے دعا مانگنا یا قبر کے پاس بہ نیت تقرب الی اللہ کھڑے ہو کر اپنے لیے دعا مانگنا۔ ان میں سے کوئی چیز جائز نہیں؛ ورموحدین انہیں چیزوں سے روکتے ہیں۔

"قبروں کے مسجد بنانے" سے حدیثوں میں بار بار منع کیا گیا ہے۔ اس باب میں بے شمار صحیح مشہور حدیثیں ہیں اور اسی بناء پر محمد بن عبد الوہابؒ کے ماننے والوں نے قبوں کو گرانے میں کوئی پس وپیش نہیں کیا۔ ایک چیز ناروا ہے، فرمان شریعت کے خلاف قبروں کو اوثان (بتوں) کی حیثیت دے دی گئی ہے۔ یہ ایک منکر ہے، اگر طاقت ہو تو اس "منکر" کے مٹانے میں دریغ نہیں ہونا چاہیئے۔

محمد بن عبد الوہابؒ کے جانشین پہلے فرماں روا نہیں، جنہوں نے قبوں کے انہدام پر توجہ کی ہو، بلکہ یہ امام شافعیؒ (۱۵۰ھ ، ۲۰۴ھ) ہی کے زمانہ (دوسری صدی کا آخر) سے چلا آتا ہے۔ امام شافعیؒ نے "کتاب الام" میں ذکر کیا ہے کہ حکام قبروں کو ہدم کرتے تھے اور فقہاء ان پر اعتراض نہیں کرتے۔" نووی نے "شرح مسلم" میں بھی ان کا یہ قول نقل کیا ہے[1]۔

اسی طرح ابن حجر ہیثمیؒ کی "الزواجر" میں بھی منقول ہے۔ ابن حجرؒ نے فقہاء کا یہ قول بھی نقل کیا ہے:۔

"تجب المبادرة لهدمها وهدم القباب التي على القبور اذ اهي اضرّ من مسجد الضرار" الخ

(ان قبروں کو اور ان قبوں کو جو قبروں پر تعمیر کیے گئے ہیں فوراً ہدم کر دینا چاہیے۔ اس لیے کہ یہ "مسجد ضرار" سے بھی زیادہ خطرناک ہیں[2]۔

مندرجہ بالا تفصیل سے یہ بات آئینہ ہوگئی کہ شیخ الاسلام محمد بن عبد الوہابؒ کسی نئے دین

---

[1] الهدية السنية: حاشیہ از علامہ سید رشید رضا (ف ۱۳۵۳ھ)؛ ص ۴۹

[2] الزواجر: ج ۱ ص ۱۶۳، مطبعہ وھبیہ، مصر

کی دعوت نہیں دیتے نہ انہوں نے کوئی نیا فقہی مذہب ہی ایجاد کیا ہے۔ وہ خود امام احمد بن حنبلؒ (ف ۲۴۱ھ) کے مذہب پر ہیں ان کی دعوت صرف کتاب وسنت کی دعوت ہے۔ وہ حنفیوں سے صرف یہ کہتے ہیں کہ وہ پکے حنفی ہو جائیں یہی مطالبہ ان کا شافعیوں سے ہے، آج امام شافعیؒ (ف ۲۰۴ھ) کی قبر پر مصر میں جو کچھ کیا جاتا ہے کیا اسے وہ کسی حالت میں روا رکھ سکتے تھے؟ یہی حال دوسرے ائمہ کا ہے۔ ان میں سے کوئی بدعات کا روادار نہیں تھا اور نہ ہو سکتا تھا، محمد بن عبد الوہابؒ کے پیرو مسلمانوں کو انہیں بدعتوں سے باز رکھنے کی دعوت دیتے ہیں اور جو بار بار فہمائش کے بعد بھی نہیں مانتا، اس سے سختی کے ساتھ بھی پیش آتے ہیں۔ ان کے اسی "شدت فی العمل" کو نہ جانے کن کن "فقہی گالیوں" سے تعبیر کیا گیا ہے، اور اسی بنیاد پر محض قیاس آرائی سے کام لے کر بے بنیاد افترا پردازیاں بھی کی گئی ہیں۔ اس مختصر سی کتاب میں سینکڑوں صفحوں کی گالیوں اور بے شمار "بہتانوں" کی فہرست پیش کرنا بہت دشوار ہے۔ پھر بھی آئندہ صفحات میں غلط بیانیوں کے کچھ نمونے دیئے جاتے ہیں۔

پانچواں باب

غلط بیانیاں اور افترا پردازیاں

وہابیت سب سے بڑی غلط بیانی شیخ الاسلامؒ کی دعوت کے متعلق یہ کی گئی کہ اسے "وہابیت" کا نام دیا گیا۔ اس طرح پر اربابِ غرض نے یہ باور کرانا چاہا کہ یہ اسلام سے الگ کوئی دین ہے۔ انگریزوں، ترکوں اور مصریوں نے مل کر اسے ایسا ہوّا بنایا کہ اسلامی دنیا میں پچھلی دو صدیوں میں جتنی تحریکیں پیدا ہوئیں اور یورپی طاقتوں نے ان سے کوئی خطرہ محسوس کیا، جھٹ اس کا ڈانڈا نجد کی وہابیت سے ملا دیا۔ مغرب کی سنوسی تحریک، فقہ کی جزئیات میں نجدی دعوت سے بالکل الگ بلکہ متناقض ہے۔ تاہم اسے بھی شیخ الاسلامؒ ہی کی دعوت کا شاخسانہ بنایا جاتا ہے اور صرف اس لیے کہ سنوسی تحریک اپنی جہادی سرگرمیوں کے باعث اٹلی کے لیے ایک عرصہ تک خطرہ بنی رہی۔ ہندوستان کی تحریک "تجدید و امارت" تو نجد سے اس طرح وابستہ کی گئی ہے کہ غیر تو غیر اپنے بھی دونوں کو ایک خیال کرنے لگے ہیں۔ اصلی مآخذ (کتاب و سنت) کے ہونے میں شبہ نہیں لیکن طریقِ کار اور اصولِ دعوت میں نمایاں فرق ہے اور اصولی مماثلت کے باوجود اپنی جگہ پر یہ ایک ناقابلِ تردید حقیقت ہے کہ حضرت سید احمد شہیدؒ (سنہ ۱۲۴۶ھ / ۱۸۳۱ء) اور مولانا اسماعیل شہیدؒ (ش سنہ ۱۲۴۶ھ) کی تحریک تجدید و جہاد پر نجدی دعوت کا بالکل اثر نہیں پڑا۔[1]

بہرحال جہاں تک وہابیت کو ایک الگ مذہب اور گمراہ جماعت بنانے کی کوشش کی

---

[1] اس مسئلے پر راقم کی "ہندوستان کی پہلی اسلامی تحریک" اور "مولانا سندھیؒ کے افکار پر ایک نظر" میں کافی مواد مل سکتا ہے۔

گئی ہے، یہ نام حد درجہ قابلِ اعتراض ہے ورنہ اس عام غلط بیانی اور بہتان تراشی سے قطع نظر دیکھا جائے تو اس نام میں کوئی مضائقہ بھی نہیں معلوم ہوتا، تحریک اصلاح و تجدید کے داعی محمد بن عبدالوہابؒ کی طرف اگر نسبت کی جاتی تو ان کے پیرووں کو "محمدی" کہنا چاہیئے تھا اور ظاہر ہے کہ مخالفین کی غرض "محمدی" کہنے سے نہیں پوری ہو سکتی تھی، اس لیے وہ اس جماعت کی نسبت داعی تحریک کے والد ماجد شیخ عبدالوہابؒ کی طرف کرنے لگے اور اس طرح پر یہ نام (وہابی اور وہابیت) مشہور ہوا اور پھر یہ نسبت ایسی چل نکلی کہ کتنے مؤرخ اور تذکرہ نگاروں نے عبدالوہابؒ کے سر تجدید و اصلاح کا سہرا باندھ دیا مثال کے طور پر ملاحظہ ہو: براجس کی کتاب (۲، ۱۳۴) ـــ یہ صاحب[1] براجس (BRYDGES) تو اپنے زعم باطل میں یہاں تک لکھ گئے کہ "صاحب دعوت کے بیٹے محمد نابینا (مزیر) تھے" (ص ۱۳۴) غلط در غلط اسی کو کہتے ہیں، حالانکہ شیخ الاسلامؒ کے بڑے بیٹے حسین بن محمد بن عبدالوہابؒ ۱۲۲۴ھ مزیر تھے۔ ہندوستانی مجاہدین کے بڑے کرم فرما ہنٹر صاحب بھی اسی غلط فہمی میں مبتلا ہیں۔ شیخ عبداللہ بن محمد بن عبدالوہابؒ کے ایک رسالہ کا ترجمہ کرتے ہوئے وہ مصنف کو بانی جماعت کا پوتا بتاتے ہیں[2]۔

بہر حال یہ "مبصر" اکیلے نہیں۔ ایک جماعت کی جماعت اسی غلط فہمی میں مبتلا ہے۔ بادیہ عرب میں گھومنے والے یورپی سیاحوں کے پیش رو نی بور[3] نے بھی بانی جماعت کا نام عبدالوہابؒ ہی بتاتا ہے اور کہتا ہے کہ "آج کل اس کے لڑکے محمدؒ جانشین ہیں"۔ یہ واضح رہے کہ نی بور ۱۷۶۴ء میں (یعنی شیخؒ کی وفات سے ۲۸ برس پہلے) بلاد عرب میں موجود تھا، لیکن اس باب میں سب سے دلچسپ غلط فہمی عیسائی مبلغوں کے سرخیل پادری زویمر کو ہوئی ہے، عام شہرت کے مطابق وہ وہابی اور وہابیت کو الگ دین یا مذہب سمجھا، پھر اس نے یہ اعتراض کر دیا کہ دیکھو

---

[1] براجس کا ماخذ برک ہارٹ ہے، اس نے بھی عبدالوہابؒ ہی کو جماعت کا بانی قرار دیا ہے (ص ۹۶ ج ۲) یہ تو یہاں تک بڑھ گیا کہ بنو تمیم کی ایک شاخ WAHHABIA الوہابی بھی اس نے وضع کر لی۔ (ص ۹۷) [2] جنرل ایشیاٹک سوسائٹی بنگال (۱۸۶۴ء ص ۶۸) [3] ص ۱۳۳ - ۱۳۱۔

ہوگارتھ[1] نے جو اقتباسات دیئے ہیں۔ ان سے صحیح اندازہ نہیں ہوتا۔ برک ہارٹ ۱۲۲۹ھ/۱۸۱۴ء میں محمد علی مصری کے قبضہ کے بعد حجاز آیا اور ۱۸۱۶ء میں اس نے "وہابیوں" سے متعلق یادداشت تیار کی جو بعد کو دو جلدوں میں NOTES ON THE BEDOUINS AND THE WAHHABYS کے نام سے شائع ہوئی ۱۸۳۱ء۔ اس نے "وہابی" کی اصطلاح بار بار استعمال کی ہے۔ کتاب مذکور کی دوسری جلد کے بہت کم صفحے اس لفظ (وہابی) سے خالی ہوں گے۔ اسی کے لگ بھگ عبدالرحمٰن جبرتی (ف ۱۲۳۸ھ) نے اپنی تاریخ مرتب کی، ان کے ہاں بھی وہابی کی اصطلاح بہ کثرت[2] استعمال ہوتی ہے۔ ۱۲۱۸ھ کے حوادث میں لکھتے ہیں :-

"وحضر صحبة الحاج كثير من اهل مكة هرو بامن الوهابی ولغط الناس فی خبر الوهابی واختلفوا فيه[3]۔

اس سے پتہ ملتا ہے کہ مصریوں کے حملہ حجاز کے وقت یہ اصطلاح عام ہو چکی تھی بعد کے لکھنے والوں نے اس جماعت کو ہمیشہ وہابی ہی کے نام سے یاد کیا۔ ہم نے ابھی کہا ہے کہ صرف نام میں کوئی مضائقہ نہیں۔ لیکن یہ نام (وہابی) اس طرح پر مشہور کیا گیا کہ یہ گویا اسلام سے الگ کوئی مذہب ہے اور یہی وجہ شکایت ہے اور اسی لیے غلط بیانیوں کی فہرست میں ہم نے اس نام کو بہت اونچی جگہ دی ہے۔

سب سے پہلا مفتری

سب سے پہلے سلیمان بن محمد بن سحیم (ف ۱۱۸۱ھ) نے شیخ الاسلام رح کی زندگی ہی میں غلط باتیں منسوب کرنا شروع کر دی تھیں۔ اس نے دنیائے اسلام کے نام اپنی گشتی چٹھی میں حسب ذیل الزام لگائے ہیں[4]:

جبیلہ میں زید بن خطاب کی قبر[5] کا انہدام، قبر کے پاس ایک مسجد کا انہدام،

---

[1] ص ۸۱-۷۸ [2] ملاحظہ ہو: ج ۳ ص ۲۳۲، ۲۳۵، ۲۵۳، الخ [3] عجائب الآثار ۳، ۲۵۵ - [4] پورا نام سلیمان بن محمد بن احمد بن علی بن سحیم ہے، اس کا باپ محمد بن احمد بھی دعوت کے مخالفوں میں تھا۔ (روضۃ: ۱، ۲۸، السحب: ص ۳۱۳) [5] یہ چٹھی روضۃ الافکار (۱، ۴۲-۴۳) میں پوری نقل کی گئی ہے۔ نیز روضۃ الافکار: ۱، ۳۷ -

"یہ وہابی ہیں" لیکن اپنے کو حنبلی کہتے ہیں[1]۔ اس غریب کو یہ خبر نہیں کہ وہابیت کی اصطلاح تو ابن قیم ؒ کے چار پانچ سو برس بعد رائج ہوئی۔

گو ہمارے پاس اس کا قطعی ثبوت نہیں کہ پہلے پہل یہ نام کس نے رکھا؟ لیکن اتنا معلوم ہوتا ہے کہ یہ نام مخالفوں نے شیخ الاسلام ؒ کی زندگی ہی میں رکھ دیا تھا۔ مارگولیوتھ[2] کا بھی یہی خیال ہے گو وہ اس باب میں سند نہیں لیکن دوسرے قرینے بھی اس کی تائید[3] میں ہیں شیخ الاسلام ؒ کے ایک معاصر (غالباً ملا عمران بن رضوان (سنہ[4])) کے ایک قصیدہ میں یہ لفظ آیا ہے۔

ان کان تابع احمد متوهبًا　　فانا المقر باننی وهابی[5]

ایک مصری[6] معاصر کا بھی یہ خیال ہے کہ یہ نام مخالفوں نے ابتدائی لڑائیوں کے زمانے ہی میں استعمال کرنا شروع کر دیا تھا۔

شیخ الاسلام ؒ کے یورپی معاصر نی بور[7] نے وہابیت کی اصطلاح استعمال نہیں کی اس وقت (۱۷۶۴ء) تک "وہابیت" کی اصطلاح رائج نہیں ہو سکی تھی البتہ وہ شیخ ؒ کی دعوت کو (NEW RELIGION) کہتا ہے گو پھر آخر میں "عبد الوہاب ؒ" کے نئے مذہب کو "محمدیت" کی اصطلاح سے بھی تعبیر کرتا ہے[8]۔ شیخ الاسلام ؒ کے تھوڑا عرصہ بعد دوسرے دو سیاحوں علی بیگ عباسی بادیا (۱۸۰۷ء) اور برک ہارٹ (۱۸۱۴ء) نے بھی نجدی تحریک اور دعوت سے بحث کی ہے۔ بادیا مصریوں کے قبضہ سے پہلے حجاز آیا تھا، افسوس کہ اس کا اصلی سفرنامہ دستیاب نہ ہو سکا جس سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا کہ اس نے "وہابی" کی اصطلاح استعمال کی ہے یا نہیں۔

---

۱ المقتطف: ج ۲۷، ص ۲۹۵ - ۲ مقالہ "وہابیت" ۳ داؤد بغدادی (ف ۱۲۹۹ھ/۱۸۸۲ء) نے بھی صلح الاخوان میں یہی خیال ظاہر کیا ہے۔ (بحوالہ NOTES ON MUHAMMEDANISM ص ۲۱۹)

۴ افسوس کہ کوشش کے باوجود صحیح زمانہ کا پتہ نہیں چل سکا، بعض قرینے بتاتے ہیں کہ یہ شیخ کے معاصر نہیں تھے۔ ۵ الهدیة السنیہ: ص ۱۱۰ - ۶ محمد حامد الفقی: ص ۶-۵ - ۷ سب سے پہلا یورپی سیاح جو ممالک عرب میں وارد ہوا (ملاحظہ ہو: باب مآخذ) ۸ جلد ۲ ص ۵ - ۱۳۳ -

دلائل الخیرات[1] اور روض الریاحین کو نذر آتش کرنا، ابن فارض اور ابن عربی کی تکفیر، سوزید اور ان کے ساتھیوں کی قبروں کا پتہ ہی نہیں۔ دلائل الخیرات اور ریاض الریاحین کے جلانے کی خبر بہتان ہے البتہ ان کتابوں کے پڑھنے سے شیخ نے ضرور منع کیا تھا۔ ابن عربی، ابن فارض اور ان جیسے متصوفین کی تکفیر شیخ سے منقول ہے:-

"وقد کفر الشیخ ابن العربی وابن الفارض وامثالھما"

دوسرے معاصر اور ان کی گالیاں

شیخ الاسلامؒ کے بعض دوسرے معاصروں نے بھی ابن سحیم کا ہاتھ بٹایا لیکن ان کتابوں میں گالیوں اور افترا پردازیوں کے سوا کچھ نہیں۔ ان مخالفوں میں احمد بن علی بصری قبانی (سنہ ۱۱۵۰ھ / ۱۷۷۵ء)[عہ]، محمد بن عبد الرحمٰن بن عفالق احسائی حنبلی (سنہ ۱۱۷۰ھ / ۱۷۵۶ء)، عبد اللہ بن عیسیٰ مویس (م ف سنہ ۱۱۷۵ھ) اور ابن فیروز (ف سنہ ۱۲۱۶ھ / ۱۸۰۱ء)[عہ] زیادہ نام آور ہیں۔ ان صاحبوں کے بعد دوسری صف میں عفیف الدین عبد اللہ بن داؤد زبیری حنبلی (ف سنہ ۱۲۲۵ھ / ۱۸۱۰ء) احمد عبد اللہ الحداد باعلوی تریمی شافعی[1] کے نام آتے ہیں مآخذ اور لٹریچر کے ضمن میں ان کتابوں کا ذکر کیا جائے گا۔ ابن غنام نے بھی ان میں سے اکثر کا ذکر کیا ہے[2] اور ابن فیروز کی ایک نظم کا جواب بھی دیا ہے۔ اب رہی ان صاحبوں کی گالیاں سو ان کے نقل کی ہمت نہیں۔ پھر بھی ان کی غیرت اور متانت اخلاق کے اظہار کے لیے ایک اقتباس کی اجازت چاہتا ہوں، امید ہے کہ اہل علم معاف رکھیں گے۔

عبد اللہ بن داؤد زبیری (ف سنہ ۱۲۲۵ھ / ۱۸۱۰ء) کی کتاب "الصواعق والرعود"[3] کے آغاز میں دو تقریظیں ہیں۔ پہلی تقریظ محمد بن فیروز حنبلی (ف سنہ ۱۲۱۶ھ / ۱۸۰۱ء) کی لکھی ہوئی ہے (مؤرخہ ۱۸ صفر سنہ ۱۲۱۰ھ)

---

[1] روضۃ الافکار: ۱، ۱۶۷، ۱۵۸، ۱۹۸۔

[عہ] ان صاحبوں کے صحیح سال وفات نہیں معلوم ہو سکے۔ یہ سنین کتاب کی تالیف کے ہیں یا یہ کہ ان سنین میں ان کا موجود ہونا ثابت ہے۔ [1] صحیح سال وفات نہ معلوم ہو سکا تیرھویں صدی ہجری میں موجود ہونا ثابت ہے۔ [2] روضۃ الافکار: ۱، ۲۰۹، ۲۱۴۔ [3] مخطوطہ مشرقی کتاب خانہ، پٹنہ: ع ۱۲۳۸۔

اس تقریظ کے آغاز ہی میں حسبِ ذیل عبارت پر نظر پڑتی ہے، جسے دیکھ کر شاید شرم و حیا بھی پانی پانی ہوجائے۔ نقل کفر کفر نہ باشد، ایک بار ذرا جی کڑا کر کے ملاحظہ کر لیجیے:-

"..... بل لعل الشیخ [یعنی عبد الوهاب] غفل من مواقعة أمه [یعنی محمد بن عبد الوهاب] فسبقه الشیطان الیها فکان ابا هذا المارد الخ

کیا لکھنؤ کی بھٹیارنیں اس سے زیادہ پھبتی کر سکتی ہیں؟ انا للہ وانا الیہ راجعون - یہ تحریر ۱۲۱۰ھ کی ہے - ابن غنام[1] ۱۲۱۱ھ کے حوادث میں، انہیں ابن فیروز کی ایک نظم کا ذکر ان الفاظ میں کرتا ہے:-

"وقد وصل الینا من هاتیك الدیار منظومة لابن فیروز...... متضمنة لاقبح العار الخ"

جس سے پتہ چلتا ہے کہ فحش گوئی ان صاحب کی سرشت میں داخل تھی۔

غلط بیانیوں کے نمونے

(الف) ادعاءِ نبوت: شیخ کی دعوت کے مخالفوں کو جب حرف رکھنے کا موقع نہیں ملتا تو وہ کہتے "کہ اصل میں یہ نبوت کا دعوےٰ کرنا چاہتے تھے، لیکن اخفا سے کام لیا[2]"۔

اسی الزام کو احمد زینی وحلان (۱۲۳۲ - ۱۳۰۴ھ) ان الفاظ میں دہراتے ہیں:-

والظاهر من حال محمد بن عبد الوهابؒ انه یدعی النبوة الا انه ما قدر علی اظهار التصریح بذلك[3]۔	اور محمد بن عبد الوہابؒ کے حالات سے پتہ لگتا تھا کہ وہ نبوت کا دعویٰ رکھتے ہیں، لیکن اس کے صاف صاف اعلان کی جرأت نہ ہوئی۔

حیرت ہے کہ فی بور نے بھی سنی سنائی باتوں پر اعتماد کر کے لکھ دیا کہ "عبد الوہاب" رسولوں کو بڑا آدمی سمجھتا تھا لیکن وہ الہام یا فرشتوں کے ذریعہ وحی پر قائل نہیں تھا[4]۔

---

[1] ۲، ۲۱۴ - [2] مصباح الانام (مخطوطہ): ورق ۵-۶ - [3] الدرر السنیة - ص ۴۶-
[4] سفرنامہ فی بور: ۲، ۱۳۴-

اس سلسلے کا ایک اور شرمناک نمونہ ہمیں راونشا (RAVENSHAW) کی اس یادداشت میں ملتا ہے جو اس نے پٹنہ کے کلکٹر کی حیثیت سے مولانا احمد اللہ صادق پوریؒ کے مقدمے میں لکھ کر دی تھی:-

"اس مصلح کا خیال تھا کہ کبھی کسی انسان کو براہِ راست اللہ کی طرف سے الہام نہیں ہوا اور کوئی مقدس کتاب ایسی وجود میں نہیں آئی جسے الہامی (DIVINE) کہہ سکیں۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ عبدالوہاب (؟) کے خیال کے مطابق کوئی مذہب الہامی ہوا ہی نہیں اور اگر وہ محمدی مذہب کو (DIVINE) کہتا ہے تو اس وجہ سے نہیں کہ یہ اللہ کے پاس سے براہ راست آیا تھا، بلکہ صرف اس کی کاملیت کی وجہ سے ہے۔"

پھر مزید ارشاد ہوتا ہے:-

"اصلاح یافتہ مسلمان (محمڈن) کی ان بدوؤں میں خوب پذیرائی ہوئی۔ جنہوں نے محمد صلے اللہ علیہ وسلم کو کبھی ایک برگزیدہ (DIVINE) آدمی نہیں تسلیم کیا اور نہ وہ قرآن کو الہامی کتاب مانتے تھے۔"

۱۸۶۵ء میں ہمارے ضلع کے اس کلکٹر کی یہ یادداشت اسی قسم کی جہالت کے نمونوں سے بھری پڑی ہے۔ مجاہدین ہند کے کرم فرما سر ولیم ولسن ہنٹر SIR W.W. HUNTER بھی اپنی کتاب میں ایک جگہ فرماتے ہیں:-

---

۱ کلکتہ گزٹ: ۲۰ رستمبر ۱۸۶۵ء ضمیمہ (ص ۴۵-۴۳۷) ۲ مولانا احمد اللہ صادقپور خاندان صادقپور پٹنہ کے ممتاز فرد اور حضرت سید احمد صاحب بریلوی کے سلسلہ میں منسلک تھے۔ آپ پر ۱۸۶۸ء / ۱۲۱۸ھ میں سازش کا مقدمہ چلا، ہائی کورٹ سے حبس دوام بعبور دریائے شور کی سزا ہوئی تقریباً سترہ برس انڈمان میں رہ کر وہیں وفات پائی (ذی الحجہ ۱۲۹۸ء۔ نومبر ۱۸۸۱ء) تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو ہندوستان کی پہلی اسلامی تحریک

۳ THE INDIAN MUSSAIMANS ص ۵۵-۵۶۔

"بدوؤں نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو کبھی برگزیدہ (DIVINE) نہیں تسلیم کیا تھا اور نہ قرآن کو الہامی کتاب" الخ۔

غالباً ان کا ماخذ مسٹر راونسا کی یہی یادداشت ہے اور ہوسکتا ہے کہ ان دونوں کا ماخذ فی بُو کا سفرنامہ ہو کہ یورپ کو اس جماعت کے متعلق پہلی اطلاع اسی کے ذریعہ ملی۔

(ب) انکارِ حدیث

زمانہ کی بوالعجبی بھی دیدنی ہے، وہ شخص جس کا اوڑھنا بچھونا سنت رسول ہو، اس پر انکارِ حدیث کا الزام رکھا جاتا ہے، اس بہتان تراشی کا سہرا ابھی "مصباح الانام" کے مصنف احمد عبد اللہ الحداد باعلوی کے سر ہے[1]۔ اس سے زیادہ عجیب تر یہ ہے کہ اس بے سروپا بہتان کو ہمارے ملک کے ایک مشہور[2] اہلِ قلم (عبد اللہ یوسف علی) نے اس بیسویں صدی میں پھر دہرایا ہے:-

"..... اور (کرامت علی) احادیث پر یقین رکھتے ہیں جنہیں وہابیوں نے مسترد کر دیا تھا۔

"وہ قدیم اور صوفی عقائد کے حامی ہیں[3]۔"

یہ ہے ہمارے مترجم قرآن کی واقفیت، ایک اسلامی جماعت کے متعلق اب آیئے ہم آپ کو عبرت اور تقابل کے لیے ایک متعصب پادری کا بیان سنائیں ہیو جنز (THOMAS PATRIC HUGHES) وہابی اور پروٹسٹنٹ جماعتوں کا باہمی مقابلہ کرتے ہوئے رقمطراز ہے

---

[1] کتاب مذکور: ورق ۵۰۶ ۔ [2] کچھ ان صاحب ہی پر موقوف نہیں، ہمارے ملک کے عالم و تعلیم یافتہ سب ایسی ہی بے سروپا باتیں اس جماعت کے متعلق لکھتے رہے ہیں۔ ان سب کے پیش رو ایک بزرگ مولوی فضل رسول بدایونی (ف ۱۲۹۸ھ / ۱۸۷۲ء) نے ایک کتاب تصحیح المسائل در تردید فرقہ نجدیہ اراذل، لکھی ہے۔ جو خرافات کا مجموعہ ہے۔ ابھی ایک معاصر نے اپنی کتاب (آثار جمال الدین) میں بھی اس جماعت کے متعلق بے سروپا باتیں لکھ دی ہیں (ص ۲۰۷، ۲۰۶)، یہ دو صفحوں کا پورا بیان غلطیوں اور غلط فہمیوں کا افسوس ناک مجموعہ ہے۔ حد یہ کہ ان کے ہاں سنوسیوں اور نجدی وہابیوں کے عقائد کچھ زیادہ مختلف نہیں ہیں (ص ۲۳۹) [3] انگریزی عہد میں ہندوستان کے تمدن کی تاریخ: ص ۱۹۲ ۔

"وہابیت کو لبسا اوقات اسلام کا پروٹسٹنٹ فرقہ بنایا جاتا ہے ...... اگرچہ بڑا فرق یہ ہے کہ عیسائی پروتستانیت مقدس الہامی کتابوں کی اعلیٰ حیثیت تسلیم کرتے ہوئے روایتی تعلیمات کو مسترد کرنا بھی ضروری خیال کرتی ہے۔ اس کے برعکس وہابیت قرآن کے ساتھ ساتھ حدیثوں پر بھی زور دیتی ہے[1]"

(ج) تکفیر و قتال مسلمین

شیخ الاسلامؒ اور ان کے ماننے والوں پر ایک الزام یہ بھی ہے کہ وہ تمام اہلِ قبلہ کی تکفیر کرتے ہیں اور مسلمانوں سے قتال جائز سمجھتے ہیں۔ یہ الزام مختلف وقتوں میں بار بار دہرایا گیا تھا اور انہوں نے خود بھی اس کی صاف صاف تردید کی تھی، ملاحظہ ہو:-

"اذا کنا لا نکفر من عبد الصنم الذی علی قبة عبد القادر و الصنم الذی علی قبر احمد البدوی و امثالهما لاجل جهلهم و عدم من ینبههم فکیف نکفر من لم یشرک بالله او لم یهاجر الینا و لم یکفر ...."	اور جب ہم ان لوگوں کی تکفیر نہیں کرتے جو جہالت اور عدمِ تنبیہ کے سبب سے ان بتوں کی پرستش کرتے ہیں جو (شیخ) عبد القادر اور (شیخ) احمد بدوی اور ان جیسے بزرگوں کی قبروں پر بنے ہوئے ہیں تو پھر ہم ان لوگوں کی تکفیر کس طرح کر سکتے ہیں جنہوں نے شرک کا ارتکاب نہیں کیا یا ہجرت کر کے ہمارے پاس نہیں آئے اور کسی کفر کے مرتکب نہیں ہوئے۔

سبحانك هذا بهتان عظيم۔

لیکن ان تردیدوں کے باوجود یہ الزام مختلف رنگ آمیزیوں کے ساتھ ساتھ بار بار دہرایا گیا ہے۔ دو تین مثالیں پیش ہیں:-

ابن عابدین شامی (ف ۱۲۵۸ھ / ۱۸۴۲ء) اپنے مشہور حاشیہ "رد المحتار" میں فرماتے ہیں:-

کما وقع فی زماننا فی اتباع عبد الوہاب	جیسا کہ ہمارے زمانے میں عبد الوہاب (؟) کا

[1] انگریزی عہد میں ہندوستان کے تمدن کی تاریخ: ص ۱۹۲۔

"الذین خرجوا من نجد وتغلبوا علی الحرمین وکانوا ینتحلون مذهب الحنابلة لکنهم اعتقدوا انهم المسلمون وان من خالف اعتقادهم مشرکون واستباحوا قتل اهل السنة وقتل علمائهم" الخ

حال ہوا، لیکن ان کا اعتقاد تھا کہ صرف یہی مسلمان ہیں اور ان کے اعتقاد کے مخالف سب مشرک ہیں اور اسی بنیاد پر انہوں نے اہل سنت اور ان کے علماء کا قتل روا رکھا۔

احمد زینی دحلان (ف ۱۳۰۴ھ / ۱۸۸۶ء) کو تو اس جماعت سے واسطے کا بیر ہے اس نے بار بار اس الزام کو دہرایا ہے۔

ہمارے ملک کے نامور اہل حدیث عالم نواب صدیق حسن خان صاحبؒ (ف ۱۳۰۷ھ / ۱۸۸۹ء) بھی اس جماعت کے بارے میں کسی فیصلے پر نہیں پہنچ سکے تھے۔ ان کی مختلف کتابوں میں اس جماعت کے متعلق الجھے ہوئے بیانات ہیں البتہ "اتحاف النبلاء" میں ان کا بیان ایک حد تک اچھا اور حقیقت سے قریب تر ہے، پھر بھی غیر مشروط "تکفیر" کا الزام اس میں موجود ہے۔ اور تو اور یمن کے نامور عالم اور محقق قاضی محمد بن علی شوکانیؒ (ف ۱۲۵۰ھ) کو بھی اس باب میں اہل نجد کے مسلک کی صحیح صحیح اطلاع نہیں مل سکی جس کے وہ خود بھی شاکی ہیں:-

"ولکنهم یرون ان من لم یکن داخلا تحت دولة صاحب نجد وممتثلا لاوامره خارج عن الاسلام وتبلغ عنهم اشیاء الله اعلم بصحتها ......"

لیکن ان کا خیال ہے کہ جو امیر نجد کے دائرۂ اطاعت سے باہر ہے وہ اسلام سے خارج ہے ان کے بارے میں اور بھی طرح طرح کی باتیں سننے میں آتی ہیں۔ اللہ جانے کہاں تک صحیح ہیں؟

پھر آگے چل کر نماز با جماعت ترک کرنے والوں سے "قتال" کی مخالفت کرتے ہیں۔ لیکن تارک صلوۃ کی تکفیر جائز رکھتے ہیں۔[۵]

---

[۱] رد المحتار: ۳، ص ۳۰۹ [۲] الدرر السنیة: ص ۴۶ - ۴۵، خلاصة الکلام: ص ۲۲۹، ۲۳۰، ۲۳۲
[۳] ترجمان وہابیہ، ہدیة المسائل، موائد العوائد، التاج المکلل وغیرہ۔ [۴] ص ۲۱۳ [۵] البدر الطالع: ۲، ۵

اہلِ نجد پر تکفیر اہلِ قبلہ کا الزام اگر مخالفوں نے رکھا تو اس کی ایک طرح پر اصلیت بھی ہے اور اس میں معمولی لکھے پڑھے لوگوں کے لیے التباس کی گنجائش ہے ہم یہاں پر اہلِ نجد کی زبان میں ان کا مسلک بیان کر دیتے ہیں جو کوئی نیا مسلک نہیں، بلکہ حنابلہ اور ظواہر کا مشہور مسلک ہے۔

شیخ الاسلامؒ کے شاگرد احمد بن ناصر بن عثمان معمری نجدیؒ (ف ۱۲۲۵ھ) نے ۱۲۱۱ھ میں علمائے حرم شریف کے سامنے جو تین مسئلے پیش کیے تھے، ان میں سے دوسرے کا خلاصہ ان کی زبان میں یہ ہے:۔

اما من قال لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ وھو مقیم علیٰ شرکہ یدعو الموتی ویسألھم قضاء الحاجات وتفریج الکربات، فھذا کافر مشرک حلال الدم والمال وان قال لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ وصلی وصام وزعم انہ مسلم۔

جو "لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ" کہنے کے بعد بھی شرک پر قائم ہے، مُردوں سے دعائیں مانگتا ان سے ضرورتوں کے پورا کرنے اور مصیبتوں کے دور کرنے کی درخواست کرتا ہے تو وہ کافر اور مشرک ہے، اس کا خون اور مال حلال ہے اگرچہ وہ لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ کہتا ہے۔ نمازیں پڑھتا اور روزے رکھتا ہے اور اپنے کو مسلمان بھی سمجھتا ہے۔

اسی رسالہ میں ابن معمر نجدی نے سُستی سے نماز پڑھنے والوں سے بھی قتال کو جائز رکھا ہے اور زہری اور امام ابو حنیفہؒ کے علاوہ تمام ائمہ کا اجماع نقل کیا ہے[1] تفصیل میں پڑنے کی گنجائش نہیں، حنابلہ کا یہ مشہور مسلک ہے اور اسی پر اہلِ نجد عامل ہیں، تارک صلوٰۃ کا کفر ان کے نزدیک متحقق ہے[2]

---

[1] لا اجماع علیٰ تارکی الصلوٰۃ کسلاً بخلاف ابی حنیفہ والزہری تفصیل کے لیے: الہدیۃ السنیۃ ص ۸۶-۶۹۔ [2] الہدیۃ السنیۃ: ص ۱۰۵

ومن لا یصل فہو لاشك کافر | کما قالہ المعصوم اکمل سین
اور جو نماز نہیں پڑھتا وہ بے شک کافر ہے | جیسا کہ سرور عالم علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشاد ہے

تارکِ صلوٰۃ کے بعد قبر پرستوں (عبّاد قبور) کا مسئلہ آتا ہے۔ شیخ کے پیش رو اور ہم مشرب معاصر محمد بن اسماعیل الامیر یمنیؒ (ف ۱۱۸۲ھ) بت پرستوں (عباد الصنام) اور قبر پرستوں کے درمیان بالکل فرق نہیں کرتے۔ شوکانیؒ نے ان کا رجوع نقل کیا ہے اور عباد قبور پر اس تشدد کی سخت مخالفت کی ہے۔ سلیمان بن سحمان نے اس "رجوع" کی پُرزور تردید کی ہے اور یہی قرین قیاس ہے، شیخ الاسلام محمد بن عبد الوہابؒ بھی محمد بن اسماعیل الامیرؒ کے ہم خیال معلوم ہوتے ہیں، البتہ اتنا فرق ہے کہ شیخ الاسلامؒ، اتمام حجت شرط قرار دیتے ہیں اور اسی لیے تمام مسلمانوں کی تکفیر نہیں کرتے۔

ومن جملة هذه الاكاذيب ماذكره

...... ان شيخ الاسلام محمد بن عبدالوهاب رحمة الله يسفك الدماء وينهب الاموال ويتجارى على قتل النفوس وتكفير الامة المحمدية فى جميع الاقطار وهذا كله كذب۔

انہیں افترا پردازیوں میں یہ بھی ہے کہ شیخ الاسلام محمد بن عبدالوہابؒ خون بہاتے ہیں اور مال لوٹتے ہیں اور لوگوں کے قتل کی جسارت کرتے ہیں۔ اور تمام دنیا کے مسلمانوں کی تکفیر کرتے ہیں۔ یہ سب سراسر جھوٹ ہے۔

اس عمومی تکفیر کی اہل نجد پُرزور تردید کرتے ہیں، لیکن اتمامِ حجت اور تبلیغ کے بعد تکفیر اور قتال کے قائل نظر آتے ہیں:۔

فلم يكفر رحمة الله الاعباد الاوثان من دعاة الاولياء والصالحين وغيرهم ممن اشرك بالله وجعل له اندادا

تو شیخ رحمہ اللہ نے صرف ان صنم پرستوں کی تکفیر کی جو اولیاء اور نیکو کار بندوں سے مرادیں مانگتے ہیں جنہوں نے حجت کے ثبوت اور طریق حق کی

---

۱ نظم الاعتقاد ص ۱۲۔ ۲ الدر النفید: ص ۴۰۔ ۳۵۔ ۳ تبرئة الشيخين الامامين: ص ۸۳۔ ۸۲۔

بعد اقامة الحجة و وضوح الحجة و بعد ان بدؤوه بالقتال فحينئذ قاتلهم وسفك دماءهم ونهب اموالهم ومعه الكتاب والسنة واجماع سلف الامة۔[1]

وضاحت کے بعد بھی شرک کا ارتکاب کیا اور اللہ کا شریک ٹھہرایا اور پھر انہوں نے قتال میں بھی پیش قدمی کی تب شیخ نے ان سے قتال کیا اور ان کا خون بہایا اور ان کا مال لوٹا اس حال میں کہ کتاب سنت و اجماع سب کی شہادتیں ان کی تائید میں ہیں۔

یہاں اتمام حجت کے علاوہ ایک دوسرا عذر یہ بھی ہے اور وہ یہ کہ مخالفوں نے قتال کی ابتداء کی۔ ایک دوسری جگہ شیخ رح کا یہ قول منقول ہے:۔

فجنس هؤلاء المشركين و امثالهم ممن يعبد الاولياء والصالحين نحكم بأنهم مشركون ونرى كفرهم اذا قامت عليهم الحجة الرسالية۔[2]

تو یہ اور ان جیسے مشرک جو ولیوں اور نیکو کار بندوں کی پرستش کرتے ہیں، ان کے بارے میں ہمارا فیصلہ یہ ہے کہ تبلیغی حجت قائم ہو جانے کے بعد ہم ان پر شرک کا حکم لگاتے ہیں اور ان کو کافر سمجھتے ہیں۔

ان اقتباسات سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ شیخ رح اور ان کے پیرو تکفیر اور قتال کے لیے تبلیغ اور اقامتِ حجت شرط قرار دیتے ہیں، اسی لیے عمومی تکفیر کے الزام کی یہ پُرزور تردید کرتے ہیں، البتہ قبر پرستی اور ظاہری مشرکانہ اعمال کو یہ صرف کفر عملی نہیں سمجھتے، جیسا کہ عام طور پر کفر عمل اور کفر اعتقاد کے درمیان فرق کیا جاتا ہے۔[3]

یہ توحید ربوبیت کو کافی نہیں سمجھتے، بلکہ توحید الوہیت کو بھی اسلام کے لیے ضروری اور

---

[1] تبرئۃ الشیخین: ص ۸۶۔ [2] الھدیۃ السنیۃ عن الھدیۃ۔ [3] رسالہ اشاعت السُّنۃ (عدد ۵ ج ۶: ۱۳۰۰ھ / ۱۸۸۲ء) نے ہندوستان کے اہل حدیث حضرات کا اختلاف اس مسلک سے ان الفاظ میں ظاہر کیا ہے: "اہل حدیث ہند، وہابیہ نجد سے تکفیر قتل میں مخالف ہیں" (ص ۲۱۷)، نواب صدیق حسن خان صاحب نے بھی "موائد العوائد" میں اس پر بہت زور دیا ہے، لیکن ان کا طرزِ بیان الجھا ہوا ہے اور کرنل فندیک امرکی

بنیادی شرط قرار دیتے ہیں۔ اللہ کو صرف خالق اور مدبر کائنات سمجھنے سے نجات نہیں ہو سکتی۔ توحید ربوبیت کے تو اہلِ جاہلیت بھی قائل تھے۔ البتہ وہ الوہیت میں شریک کرتے تھے اور اسی لیے وہ ہر شجر، حجر کو جس کی وہ پرستش کرتے اِلٰہی کے نام سے موسوم کرتے اس زمانے کے جاہلوں اور مشرکوں نے غیر اللہ کو کہنے سے تو پرہیز کیا، لیکن الوہیت کے تمام لوازم (نذر، دعا، طواف، قربانی وغیرہ) غیر اللہ کے لیے بھی عام کر دیئے اور اس کا نام توسل یا استشفاع رکھ دیا تو نام رکھنے سے حقیقت نہیں بدل سکتی۔[1]

یہ ہے خلاصہ شیخ کے مسلک کا۔ جماعت کی کتابوں میں اس مسئلہ کی پوری پوری وضاحت کی گئی ہے۔ سلیمان بن سحمان کی "تبرئۃ الشیخین الامامین" (ص ۸۲ - ۲۱۵) تو اسی کے لیے وقف ہے۔ مآخذ کے ضمن میں دوسری کتابوں کا ذکر آتا ہے، تفصیل کے لیے ان کی طرف رجوع کرنا مناسب ہوگا۔ یہاں پر صرف ایک بات ذہن نشین کر لینا چاہیئے کہ اہلِ نجد مسلمانانِ عالم کی عمومی تکفیر نہیں

(بقیہ حاشیہ ص ۱۵۴) کی کتاب "المرآۃ الوضیۃ فی الکرۃ الارضیۃ" پر اعتماد کے باعث بہت سی غلط باتیں بھی لکھ گئے ہیں، جن سے اہل نجد کا دامن پاک رہا ہے۔

[1] "تبرئۃ الشیخین الامامین" کے حاشیہ میں ایک جگہ پر (ص ۱۲۴) علامہ سید رشید رضا مرحوم نے ایک دلچسپ بات لکھی ہے، وہ کہتے ہیں کہ اہلِ جاہلیت صحیح لغت کی واقفیت کی بنا پر اپنے ہر معبود (شجر ہو یا حجر) کو اِلٰہی کہتے تھے، اس لیے کہ لفظ کے صحیح معنیٰ یہی ہیں، اس کے برعکس ہمارے زمانے کے مشرک لغت اور زبان سے ناواقفیت کی وجہ سے یہ سمجھے کہ اسلام غیر اللہ کو اِلٰہ کہنے سے روکتا ہے، ورنہ عبادت کی تمام باتیں (مردوں سے مرادیں مانگنا، نذر، قربانی، قبروں کا طواف) ان کے نزدیک توحید کے منافی نہیں۔ تو اس طرح پر مشرکینِ جاہلیت نے صرف دین پر ظلم کیا اور اس زمانہ کے مسلمان مشرکوں نے دین اور زبان دونوں پر ظلم کیا (وکذٰلک قلت ان مشرکی المسلمین قد جنوا علی الدین واللغۃ العربیۃ ومشرکی الجاھلیۃ حافظوا علی لغتھم فسمعوا کل شئ باسمہ)

کرتے بلکہ صرف ان لوگوں کو جو مشرکانہ اعمال میں گرفتار ہیں اور تبلیغ و دعوت کے بعد بھی اپنی گمراہی سے باز نہیں آتے اور ایسے لوگوں سے قتال بھی جائز قرار دیتے ہیں۔

شیخ رح نے اپنی مختلف کتابوں میں اس حقیقت کو بار بار دہرایا ہے اور حضرت ابوبکر رض کے قتالِ مانعین زکوٰۃ سے بار بار استدلال کیا ہے۔

مندرجہ بالا اقوال و اقتباسات میں جہاں تردید ہے وہ اسی عمومی تکفیر کی تردید ہے اور جہاں اس کا اعتراف ہے، وہاں اتمامِ حجت اور تبلیغ کے بعد بھی مشرکانہ اعمال پر اصرار کرنے والوں سے متعلق ہے۔

اگر الزام عائد کیا جائے اور اس کا منشا بھی بتا دیا جائے تو انسان غور کر سکتا ہے اور اور ممکن ہو تو غلط فہمی کے ازالے کی بھی کوشش کی جا سکتی ہے لیکن خواہ مخواہ کی بدگمانی اور بے بنیاد غلط بیانی پر تو صرف اظہار افسوس ہی کیا جا سکتا ہے۔ ہمیں یہ دیکھ کر انتہائی دکھ ہوا کہ اس دور میں ہمارے ملک کے بعض مشہور علماء شیخ محمد بن عبد الوہاب رح کے متعلق عجیب و غریب خیال رکھتے تھے۔ مولانا سید انور شاہ کشمیری (ف ۱۳۵۲ھ / ۱۹۳۳ء) جیسے عالم کا شیخ کے متعلق یہ لکھنا:

اما محمد بن عبد الوهاب النجدى	اور محمد بن عبد الوہاب نجدی تو ایک کم علم اور
فانه كان رجلا بليدا قليل العلم فكان	کم فہم انسان تھا اور اسی لیے کفر کا حکم لگانے
يتسارع الى الحكم بالكفر [1]	میں اسے کوئی باک نہیں تھا۔

تو حد درجہ افسوسناک اور تکلیف دہ ہے۔ حیرت ہے کہ "کتاب التوحید" کے مصنف کو مولانا سید انور شاہ صاحب نے "بلید" اور "قلیل العلم" کہنے کی جرأت کیسے کی؟

(د) عام غلط بیانی

شیخ رح اور ان کے ماننے والوں کے متعلق طرح طرح کی بے بنیاد باتیں شروع ہی سے کہی جانے لگی تھیں۔ شیخ الاسلام رح کے صاحبزادے شیخ عبد اللہ بن محمد بن عبد الوہاب رح کے اس رسالہ میں بھی جو انہوں نے ۱۲۱۸ھ / ۱۸۰۳ء

[1] فیض الباری: ۱، ۱۷۱۔

میں اہلِ مکہ کے لیے لکھا تھا اس قسم کی غلط بیانیوں کی تردید کی گئی ہے۔

واما ما یکذب علینا سترًا للحق ...... بانا نفسر القرآن برأینا ونأخذ من الحدیث ما وافق فهمنا ...... وانا نضع من رتبة نبینا صلی اللہ علیه وسلم بقولنا: النبی رمة فی قبره وعصا احدنا انفع منه، ولیس له شفاعة وان زیارته غیر مندوبة ...... وانا مجسمة وانا نکفر الناس علی الاطلاق ...... فجمیع هذه الخرافات واشباهها ...... کان جوابنا فی کل مسألة من ذلک سبحانك هذا بهتانٌ عظیم ۵

(الهدیة السنیه ص۴۶)

اور یہ جو حق پوشی کی راہ سے ہمارے متعلق جھوٹ کہا جاتا ہے کہ ہم قرآن مجید کی تفسیر اپنی رائے سے کرتے ہیں اور حدیث نبوی سے وہی حصہ لیتے ہیں جو ہمارے فہم (اور ذوق) کے مناسب ہو اور یہ کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی شان گھٹانے کے لیے النبی رُمَّة فی قبرہٖ (نبی کریم قبر میں ایک بوسیدہ ہڈی سے زیادہ نہیں) اور عصا احدنا انفع منہٗ (ہم میں سے کسی ایک کی چھڑی ان سے زیادہ نفع بخش ہے) جیسے دگستاخانہ) فقرے کہا کرتے ہیں اور یہ کہ رسول کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کو شفاعت کا حق نہیں ہوگا! اور یہ کہ قبر اطہر کی زیارت مستحب نہیں ہے! اور یہ کہ ہم تجسیم کے قائل ہیں! اور یہ کہ ہم تمام لوگوں کی علی الاطلاق تکفیر کرتے ہیں۔ تو ان سب اور ان جیسی دوسری بے سر و پا باتوں میں سے ہر ایک کے متعلق ہمارا جواب "سبحانك هذا بهتانٌ عظیم" کے سوا کچھ نہیں ہے۔

(ھ) انہدام قبہ نبوی

مخالفوں نے ایک بے بنیاد الزام یہ بھی تراشا کہ سعود بن عبد العزیز بن محمد بن سعود (۱۲۱۸ھ/۱۸۰۳ء - ۱۲۲۹ھ/۱۸۱۴ء) نے

لہ آلوسیؒ نے "تاریخ نجد" (ص ۹ - ۴۵) میں اور نواب صدیق حسن خاں صاحبؒ نے "اتحاف النبلاء" (ص ۲۰۶-۲۱۴) میں رسالے کا یہ حصہ پورا پورا نقل کیا ہے۔

قبہ نبوی کو بھی منہدم کرا دیا تھا یہ عجیب بات ہے کہ یورپی مورخوں نے خواہ مخواہ اس بے سروپا افسانے کو مزے لے لے کر بیان کیا ہے۔ سٹارڈ (حاضر: ۱، ۲۶۴) ہیوجز۔ ڈکشنری آف اسلام ص ۶۶۰) زویمر (ص ۱۹۵) بلنٹ (فیوچر آف اسلام: ص ۴۵) مارگولیوتھ (انسائیکلوپیڈیا آف ریلیجن اینڈ اتھکس: ۲، ۶۶۱) اور ان کے علاوہ ایک جماعت ہے جس نے اس بے بنیاد الزام کو موقع بے موقع دہرانے کی کوشش کی ہے، حالانکہ یہ بالکل بے بنیاد اور سراپا افترا ہے اس کی تعمیر کے متعلق ان کا جو کچھ بھی خیال ہو لیکن قبۃ الرسول ؐ کی طرف بری نگاہ سے دیکھنے کی بھی انہوں نے کبھی جرأت کی! عام قبوں کے انہدام اور زر و جواہر کی تقسیم کا وہ خود خوشی خوشی ذکر کرتے ہیں۔ یہاں ان کے متعلق از راہِ الزام جو کچھ کہا جاتا ہے وہ خود اس کا اعتراف کرتے ہیں، لیکن یہ الزام واقعی بہتان ہے اور قبۃ الرسولؐ کے ساتھ سوءِ ادب کی روایت یکسر بے بنیاد اور افترا ہے۔

برائجس (جو اہل نجد کے دورِ عروج میں بصرہ اور بغداد میں رہ چکا ہے)، اس افترا کی تائید تو نہ کر سکا لیکن اہل نجد کی نیت پر حملہ کرنے سے باز نہیں رہا، وہ لکھتا ہے:-

"اس نے (سعود بن عبد العزیز) قبہ شریف کے انہدام کا بھی ارادہ کیا[1]، لیکن غالباً قبے کے استحکام یا منہدم کرنے والے آلات کی کمی کے باعث ایسا نہ کر سکا اور قبہ محفوظ رہ گیا۔"

ان برائجس صاحب کی شخصیت اور ان کے بیان کی اہمیت تو اگلے باب سے معلوم ہوگی

---

[1] ص ۲۴ برائجس صاحب کے پیش رو اور پیر مغاں برک ہارٹ (جس کی کتاب سے وہ تقریباً حرف بہ حرف نقل کرتا ہے) نے صرف اس قدر لکھا تھا:-

"اس نے مقبرہ کے بڑے گنبد کو بھی گرانے (DESTROY) کی کوشش کی"۔ (ج ۲: ص ۱۹۹) نے غالباً اسے حاشیہ آرائی کی کوشش کی ہے لیکن برک ہارٹ کی یہ اطلاع یقینی غلط ہے، آگے چل کر وہ خود لکھتا ہے کہ مقبرہ کو گزند نہیں پہنچا۔

یہاں اتنا کہہ دینا کافی ہوگا کہ یہ بصرہ ۱۷۸۴ء ہی میں آچکا تھا، یعنی شیخ الاسلام ؒ کی زندگی ہی میں عرب علاقوں سے اس کا تعلق پیدا ہو گیا تھا جو مختلف حیثیتوں میں ایک عرصہ تک قائم رہا۔

ایک واقف کار انگریز کی شہادت

غلط بیانیوں اور افترا پردازیوں کا انبار ہے۔ کہاں تک انہیں کھنگالا جائے،

اب ہم اس گفتگو کو برا کجس ہی کے ایک بیان پر ختم کرتے ہیں، جس میں اس نے بعض غلط بیانیوں کی تردید کی ہے:۔

"باب عالی نے مشہور کیا کہ اس نے (سعود بن عبد العزیز) مدینہ منورہ کی زیارت سے لوگوں کو روک دیا ہے لیکن یہ صحیح نہیں، اس نے صرف روضہ (مطہرہ) کے سامنے مشرکانہ اعمال کے ارتکاب سے منع کیا ہے، جیسا کہ دوسرے ولیوں کی قبروں پر بندش کر چکا ہے[1]۔

"بعض جاہل انہیں کافر سمجھتے ہیں، افواہوں پر ترکوں نے اعتماد کیا، اشراف مکہ نے اسے ہوا دی۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ وہ قرآن و حدیث پر پورے عامل ہیں۔ برک ہارٹ نے صحیح لکھا ہے یہ سب غلط فہمیوں کا نتیجہ تھا۔ اصل میں یہ اسلام کے اندر خالص تطہیر (PURITANISIM) کی تحریک تھی۔

"ایک بے وقوف فرنچ نے ۱۸۰۵ء میں لکھا کہ یہ کوئی نیا مذہب ایجاد کر رہے ہیں، نیز وہ سعود کے "خاص آدمی" کی زبانی حج کی منسوخی کا بھی ذکر کرتا ہے۔ یہ سب جھوٹ ہے۔ وہابی قرآن کی طرح حدیث کو بھی اصولی چیز (FUNDAMENTAL) مانتے ہیں۔ البتہ اولیا اور انبیاء کو یہ انسان مانتے ہیں۔ فتح مکہ کے بعد سعود نے جو اعلان کیا تھا وہ آج بالکل کتاب و سنت کے مطابق تسلیم کیا جاتا ہے۔ تمباکو نوشی مالکیہ کے ہاں ممنوع ہے، انہوں نے بھی ممنوع کیا۔"

---

[1] (۲، ۲۰۰، ۱۱۰ - ۱۰۹) ایضاً

"البتہ قہوہ کے امتناع کی خبر بالکل غلط ہے۔ اسے ترکوں نے پروپیگنڈے کے طور پر مشہور کیا۔ جس بے وقوف فرنچ[1] نے حج کے تعطل کا ذکر کیا ہے، اسے جاننا چاہیئے تھا کہ سعود نے "حج" کے بڑے مراسم کو روکا تھا۔ مکہ میں داخلہ کے بعد اس نے جو پہلا کام کیا وہ طواف وعمرہ کی ادائیگی تھی[2]۔

ایک عجیب افتراء

سلیل بن رازق کی (IMAMS AND SYEDS OF OSMANI) میں ایک بدوی شیخ کی زبانی یہ افسانہ نقل کیا گیا ہے کہ "وہابیوں" کے پاس قرآن مجید کا وہ حصہ بھی ہے، جسے حضرت عثمانؓ نے اپنے مصحف سے حذف کر دیا تھا۔"

خیریت یہ ہے کہ مترجم نے خود اس روایت کو ضعیف قرار دیا ہے[3] اور شاید اسی لیے کسی نے اسے دہرایا نہیں۔ ہم نے یہاں صرف مخالفوں کی اوچھی حرکتوں اور احمقانہ افتراء پردازیوں کا پردہ چاک کرنے کے لیے اس کا ذکر کر دیا جو لوگ دروغ بیانی اور افتراء پردازی میں اس حد تک جا سکتے ہیں ان سے کیا توقع کی جا سکتی ہے؟

---

[1] ROUSSEAU نے ۱۸۰۸ء میں مندرجہ ذیل دو کتابیں لکھیں جس میں اس نے وہابیوں پر "حج" کے روکنے کا بے بنیاد الزام رکھا ہے:-

(1) PASHALIK DE BAYHDAD

(2) A MEMOIRS IN THE MINES، DE'L ORIENT

[2] براجس: ص ۱۱۴ - ۱۰۶، برک ہارٹ: ۲، ۲۱۵ - ۲۰۰

[3] ص ۲۵۳ - ۲۵۱ - [4] حاشیہ ص ۳ - ۳۵۱

چھٹا باب

ماٰخذ اور لٹریچر

(ا) تاریخی

(۱) روضۃ الافکار و الافہام لمرتاد حال الامام و غزوات ذوی الاسلام
مصنفہ حسین بن غنام احسائی (ف ۱۲۲۵ھ)

یہ کتاب شیخ کی سیرت پر سب سے زیادہ مستند کتاب ہے مصنف شیخ کے شاگرد اور واقعات کے عینی شاہد ہیں۔ کتاب دو جلدوں میں ہے پہلی جلد میں ذاتی حالات، دعوت اور تبلیغی رسالوں کا ذکر ہے بعض طویل رسالے پورے پورے اس میں نقل کر دیئے گئے ہیں۔ دوسری جلد جنگوں اور مختلف واقعات کی تاریخ پر مشتمل ہے۔ ترتیب سنہ وار ہے ۱۱۶۰ھ سے شروع ہو کر ۱۲۱۲ھ پر کتاب ختم ہوتی ہے۔

مطبع مطفویہ بمبئی میں چھپی تھی (۱۳۳۷ھ) لیکن اس وقت گویا ناپید ہے۔ بروکلمن کو بھی اس مطبوعہ نسخے کا پتہ نہیں تھا۔ اس کا ایک نہایت اچھا قلمی نسخہ ندوۃ العلماء کے کتاب خانے میں ہے۔ ہمیں مطبوعہ نسخہ شرف الدین واولاد و محمد علی روڈ بمبئی کی عنایت سے مستعار ملا جس کے لیے ہم ان کے شکر گزار ہیں۔

(۲) عنوان المجد فی تاریخ نجد: مصنفہ عثمان بن بشر نجدی (ف ۱۲۸۸ھ) مصنف نے شیخ

ؔ بروکلمن (ذیل: ۲، ۲۳۱) نے ابن بشر (ف ۱۲۸۸ھ) اور عثمان بن قائد النجدی الحنبلی ف ۱۰۹۷ھ "السحب الوابلہ" ورق ۸۰ ب) صاحب "نجاۃ الخلف باعتقاد السلف" کے درمیان خلط ملط کر دیا ہے۔

کے فرزندوں اور سعود بن عبد العزیز (۱۲۱۸ھ/۱۸۰۳ء - ۱۲۲۹ھ/۱۸۱۴ء) کا زمانہ پایا ہے۔ کتاب کا آغاز شیخ کی سیرت اور ۱۱۵۸ھ کے واقعات سے ہوتا ہے، پہلی جلد ۱۲۳۶ھ کے واقعات پر ختم ہوتی ہے، دوسری جلد ۱۲۶۷ھ کے واقعات پر ختم ہو جاتی ہے۔ مصنف نے شعبان ۱۲۷۰ھ میں کتاب کی تبییض سے فراغت حاصل کی۔

تفصیل اور واقعات کی تنقیح کے لحاظ سے اسے "ابن غنام" کی کتاب پر ترجیح حاصل ہے — پہلے بغداد میں ناقص چھپی تھی (۱۳۲۸ھ) ہمارے سامنے مطبعہ سلفیہ مکہ مکرمہ کا طبع شدہ مکمل نسخہ ہے۔ (۱۳۴۹ھ)

واقعات کی تدوین میں ہم نے زیادہ تر اعتماد انہیں دونوں کتابوں پر کیا ہے۔ شیخ کی دعوت اور آلِ سعود کی تاریخ پر دونوں کتابیں اصل اور اُم کا حکم رکھتی ہیں۔

(۳) ان دونوں کتابوں کے علاوہ ایک تیسری کتاب "مثیر الوجد فی معرفۃ انساب ملوک نجد" کا بھی ذکر آتا ہے جو شاید نجد کی تاریخ میں اصل اور ماخذ کا کام دے سکے۔ ماردتمان[1] اور خیر الدین زرکلی[2] نے اس کا حوالہ دیا ہے۔ اس کے مصنف رشید بن علی حنبلی - غالباً ابن بشر کے معاصر ہوں گے، افسوس کہ ہمیں یہ کتاب دستیاب نہ ہو سکی۔

(۴) "عجائب الآثار فی التراجم والاخبار" مصنفہ عبد الرحمن بن حسن جبرتی مصری (۱۱۶۷ھ/۱۷۵۴ء - ۱۲۳۷ھ/۱۸۲۲ء) اس کی ترتیب بھی سنہ وار ہے۔ ۱۱۰۰ھ کے حوادث سے شروع ہو کر ۱۲۳۶ھ کے حوادث پر ختم ہوتی ہے، محمد علی پاشا کے حملوں اور مصر و حجاز کی آویزش پر اس کی شہادت خاص اہمیت رکھتی ہے۔ مصر اور اس کے متعلقات میں ہم نے جبرتی کے بیان کو ترجیح دی ہے۔ (مطبوعہ مصر: ۱۲۹۷ھ چار جلدوں میں)

(۵) "خلاصۃ الکلام فی امراء البلد الحرام": مصنفہ احمد بن زینی دحلان مکی شافعی (۱۲۳۲ھ - ۱۳۰۴ھ/۱۸۸۶ء) اس کتاب میں اشرافِ مکہ کی مکمل تاریخ ہے، مکہ مکرمہ کے آخری دور کے حکام کی

---

[1] مقالہ ابن سعود، انسائیکلوپیڈیا آف اسلام، [2] الاعلام: ص ۳۶۸، ۵۵۸۔

اتنی تفصیلی تاریخ مجھے اور کوئی نہیں ملی۔ اس لیے دحلان پر عدمِ اعتماد کے باوجود، اشرافِ مکہ سے متعلق اس کے بیانات کو اہمیت دینا پڑی۔ یہ کتاب سنہ ۱۳۰۱ھ میں تالیف ہوئی۔ علامہ رشید رضا مرحوم نے "الہدیۃ السنیہ" کے حاشیہ (ص ۲) میں لکھا ہے کہ:۔

"یہ دعوت کے ظہور کے زمانے میں مفتی تھے اور اپنے آقایانِ ولی نعمت کے چشم و ابرو کے اشارے پر اس جماعت کے متعلق غلط باتیں مشہور کیا کرتے تھے"۔۔۔۔۔ انھوں نے غلط بیانی اپنے یقین و اعتقاد کی بناء پر کی ہو یا کسی کے اشارے پر، اس سے بحث نہیں البتہ یہ کہنا غلط ہے کہ "یہ دعوت کے ظہور" کے زمانہ میں مفتی تھے۔ سنہ ۱۲۳۳ھ/۱۸۱۸ء میں درعیہ برباد ہوا اور دعوت کا "ظہور" سردست ختم ہو گیا۔ مفتی احمد زینی دحلان کے شباب میں مکہ مکرمہ میں شاید کسی نجدی کا گزر بھی نہ ہوتا ہو۔

(۶) "فتاویٰ و افادات عبد الوہاب" الخ (مخطوطہ فارسی)۔ یہ ایک مختصر سا قلمی رسالہ ہے جس میں امیر عبد العزیز بن سعود (۱۱۷۹ھ/۱۷۶۵ء۔ سنہ ۱۲۱۸ھ/۱۸۰۳ء) کی طرف سے فتح علی شاہ قاچار (۱۲۱۲ھ/۱۷۹۸ء۔ سنہ ۱۲۵۰ھ/۱۸۳۴ء) کے نام ایک مکتوب اور بلاغ عام ہے اور آخر میں فتح علی شاہ کا جواب اور دھمکی ہے (مورخہ سنہ ۱۲۱۹ھ/۱۸۰۴ء؛ مخطوطہ مشرقی کتاب خانہ: فہرست انگریزی مشروحہ ۱۳۳۷ء)

(۷) "البدر الطالع": محمد بن علی بن محمد بن عبد اللہ الشوکانی رح (سنہ ۱۱۷۳ھ/۱۷۶۰ء۔ سنہ ۱۲۵۰ھ/۱۸۳۲ء) کی "البدر الطالع" میں گو آلِ سعود کے متعلق صرف مختصر "تراجم" ہیں[۱]، پھر بھی ان کی ایک قیمت ہے کہ محدث شوکانی رح نے بڑی عمر پائی اور شیخ رح سے لے کر آلِ سعود کا عروج و زوال دونوں اپنی آنکھوں سے دیکھا۔

(۸) "تاریخ نجد": مصنفہ محمود شکری آلوسی (سنہ ۱۲۷۳ھ/۱۸۵۷ء۔ ۱۳۴۲ھ/۱۹۲۴ء) نجد کی مختصر تاریخ ہے جس میں شیخ کی دعوت اور آلِ سعود کی تاریخ کا بھی تذکرہ ہے۔ معلومات عام طور پر صحیح ہیں۔ ابن غنام اور ابن بشر کے مآخذ ہیں، شیخ اور ان کے شاگردوں کی تصنیفات بھی ان کے پیشِ نظر

---

[۱] البدر الطالع: ۱: ۲۶۳، ۲: ۵

تھیں ——— مطبوعہ قاہرہ ۱۳۴۳ھ۔

(۹) "الرحلۃ الحجازیۃ" مصنفہ محمد لبیب بتنونی۔ اس میں اشراف مکہ کی حکومت کا بیان مختصر اور مرتب ہے۔ غالباً ان کا زیادہ تر اعتماد وحلان کی "خلاصۃ الکلام" پر رہا ہے۔ محمد بن عبد الوہابؒ اور ان کی دعوت کا بھی ذکر ہے لیکن صحت روایت کا التزام نہیں (ص ۷۳-۹۴) مطبوعہ مصر ۱۳۲۹ھ (طبع دوم)

(۱۰) "حاضر العالم الاسلامی" (۴:[1] ص ۱۷۳-۱۶۱) "تاریخ نجد الحدیث" کے عنوان سے امیر شکیب ارسلان نے شیخ اور آل سعود کے متعلق ایک الگ فصل اپنی کتاب میں دی ہے۔ ان کا مآخذ زیادہ تر غیروں کی کتابیں ہیں، اس لیے غلطیوں سے خالی نہیں پھر بھی غنیمت ہے اور اس کے پڑھنے سے ایک اجمالی خاکہ ذہن میں آجاتا ہے۔

(۱۱) "الزہراء" (رجب ۱۳۴۵ھ: ۳-۷) محب الدین خطیبؒ کا شیخ کی زندگی پر ایک مختصر اور جامع مقالہ۔ خطیب نے زیادہ تر ابن بشر اور ابن غنام سے اخذ کیا ہے اس لیے بیانات مستند ہیں۔ ایک آدھ جگہ "مثیر الوجد" کا بھی حوالہ ہے۔ راقم نے کتاب کے پہلے باب میں اس مضمون سے بہت فائدہ اٹھایا ہے، گو ان کے اصلی مآخذ بھی میرے سامنے تھے۔

(۱۲) "اثر الدعوۃ الوہابیۃ فی جزیرۃ العرب": محمد حامد فقی کا ایک مختصر رسالہ ہے جس میں شیخ کی دعوت پر ہمدردانہ انداز میں بحث کی گئی ہے۔ مصنف کے تعلقات علمائے نجد سے بھی گہرے ہیں، اس لیے ان کی معلومات مستند اور ایک حد تک (OFFICIAL) بھی کہی جا سکتی ہیں۔ مگر افسوس کہ انھوں نے کہیں حوالہ نہیں دیا۔ عرب[2] معاصروں نے اور بھی کتابیں لکھی

[1] دوسرا ایڈیشن: قاہرہ ۱۹۳۲ء۔ [2] معاصروں میں امین ریحانی مشہور عیسائی ادیب کی کتابوں کا بڑا غلغلہ ہے۔ ان کے انگریزی اور عربی ایڈیشن ہاتھوں ہاتھ نکل چکے ہیں۔ ان کی ملوک العرب ہماری نظر سے گزری معلوم ہوا کہ ایک اخبار نویس سے زیادہ ان کے معلومات کو وقعت نہیں دی جا سکتی۔ موجودہ جدید طرز کی انشاء ہے مگر مواد نہیں تحقیق تو سرے سے مفقود ہے۔

ہیں لیکن کسی نے تحقیق و تاریخ نگاری کا فرض ادا نہیں کیا۔ (مطبوعہ مصر: ۱۳۵۴ھ) طوالت کے خوف سے ہر ایک پر الگ الگ تبصرہ نہیں کیا جا سکتا۔

(۱۳) "جزیرۃ العرب فی القرن العشرین": مصنفہ حافظ وہبہ۔ یہ ایک جامع کتاب ہے اور اس کے مصنف سلطان عبدالعزیز بن عبدالرحمٰن آل سعود موجودہ فرمانروائے نجد و حجاز کے معتمد علیہ ہیں۔ کتاب اچھی اور پر معلومات ہے۔ دعوت (ص ۳۴۷-۲۳۱) آل سعود (ص ۲۷۷-۲۴۳) اور اخوان (ص ۳۳۰-۳۱۱) پر بھی تین الگ فصلیں ہیں۔ غلطیاں بہت کم اور زیادہ ترسنین کی تطبیق کی ہیں۔ محمد بن سعود کی وفات کی تاریخ ۱۷۶۵ء کی جگہ ۱۷۶۶ء دی ہے۔ (ص ۲۴۴) اسی طرح شیخ کی وفات ۱۷۹۱ء میں درج کی ہے۔ (ص ۳۳۸) حالانکہ صحیح ۱۷۹۲ء ہے اور بھی معمولی فروگزاشتیں ہیں لیکن مجموعی حیثیت سے کتاب غنیمت ہے۔

(۱۴) "اتحاف النبلاء" (فارسی) (ص ۴۱۳-۴۱۶) نواب صدیق حسن خاں صاحبؒ (ف ۱۳۰۷ھ) نے اس کتاب میں بھی شیخ کا حال لکھا ہے اور ایک حد تک منصفانہ ہے (مطبع نظامی ۱۲۸۸ھ) (اس کے علاوہ التاج المکلل، موائد العوائد وغیرہ میں بھی شیخ اور ان کی دعوت کا ذکر ہے)

(۱۵) ترجمان وہابیہ (اردو) اس رسالہ میں نواب صدیق حسن خاں صاحبؒ نے جماعت کے متعلق عجب متضاد اور بے جوڑ باتیں کہی ہیں۔ غالباً وہ اپنے وقت کے مخصوص حالات سے گھبرا گئے تھے۔ اللہ ان کی مغفرت کرے۔ (مطبوعہ امرتسر، ۱۹۳۰ء)

(۱۶) "سلاطین نجد کا مذہب" (معارف: نومبر ۲۴ء) اس مختصر مقالے میں استاذ محترم مولانا سید سلیمان ندوی مدظلہ نے شیخ کی دعوت اور آل سعود کا مختصر اور دلنشیں خاکہ پیش کیا ہے۔ اس کا تمہیدی حصہ خاص طور پر دل آویز ہے (جس کا ابتدائی ٹکڑا اس کتاب

۱؎ مولوی اسمٰعیل صاحب غزنوی نے "الہدیۃ السنیۃ" کا اردو ترجمہ کیا ہے (جس کا ذکر آگے آتا ہے) ترجمہ تو خیر جیسا بھی ہے اس سے بحث نہیں لیکن انہوں نے غضب یہ کیا کہ حضرت سید صاحب مدظلہ کی پوری تمہید اپنے دیباچہ میں اس طرح نقل کر دی گویا انہیں کی لکھی ہوئی ہے اللہ ان کی اس لغزش کو معاف کرے۔

کا سفرنامہ ہے)

(۱۷) "تاریخ نجد": مصنفہ حافظ اسلم صاحب جیراجپوری شیخ کی سیرت دعوت اور آل سعود کی تاریخ پر ایک مختصر اور سیدھی سادی کتاب ہے زیادہ تر ابن غنام اور ابن بشر کی کتابیں ان کا مآخذ رہی ہیں، سادہ اور ہلکی پھلکی تاریخ کی حیثیت سے غنیمت ہے، گو غلطیوں سے خالی نہیں

(۱۸) "سلطان ابن سعود": سلطان ابن سعود کی سیرت، سردار محمد صاحب حسینی بی۔اے نے لکھی ہے۔ اس میں ایک باب شیخ کی دعوت (ص ۴۵-۳۹) پر بھی ہے، آل سعود اور آل رشید کی تاریخ بھی دی گئی ہے (ص ۷۰-۴۵)، ان کا سارا مدار انگریزی کتابوں پر معلوم ہوتا ہے۔ عربی اور اسلامیات سے شاید ادنیٰ لگاؤ بھی نہیں۔ ان کی واقفیت کا عالم یہ ہے کہ مقرن کو مکرن اور مکران، مشاری کو مشعری، ثنیان کو طوہنیان لکھتے ہیں۔ (ص ۸) اسی طرح عیینہ کو عیونیہ، الحسا کو الحصار (ص ۴۲) لکھا گیا ہے۔ تاریخی اسناد کا یہ عالم ہے کہ محمد بن سعود کا سال وفات ۱۷۶۴ء (؟ ۱۷۶۵ء / ۱۱۷۹ھ) اور عبد العزیز بن سعود کی شہادت کی تاریخ ۱۸۰۲ء (۱۸۰۳ء / ۱۲۱۸ھ) بتاتے ہیں۔ (ص ۴۳-۴۴) سب سے دلچسپ بات یہ ہے کہ مصنف کے بیان کے مطابق امام احمد بن حنبلؒ نے موطا امام احمد حنبل مرتب کی تھی (ص ۴۵)۔ — کوئی بتلاؤ ہم بتلائیں کیا؟

جس شخص کے علم کا یہ عالم ہو اسے سلطان ابن سعود کی سیرت لکھنے کی کیا ضرورت آپڑی تھی؟ ہم نے یہاں تاریخی لٹریچر کے ضمن میں اس کتاب کا ذکر صرف عبرت کے لیے کیا ہے —— "وہابیوں" کے متعلق ان صاحب نے جو غلط بیانیاں کی ہیں (ص ۳-۲۶۲) ان کے ذکر کی شاید اب ضرورت بھی نہیں۔

(۱۹) نی بورؔ کا سفرنامہ

TRAVELS THROUGH ARABIA AND OTHER COUNTRIES IN THE EAST.

ؔ امیر شکیب ارسلان نے پورا نام (CARESTEN NIE BUHR) لکھا ہے۔ (ملحق تاریخ ابن خلدون ص ۷۷)

یہ سب سے پہلا یورپی سیاح ہے جس نے نجد اور شیخ الاسلامؒ کی دعوت پر اپنے سفرنامہ میں بحث کی۔ گو اس کا بیان بہت مختصر ہے (جلد دوم ص ۱۳۶ - ۱۳۱) پھر بھی اس لحاظ سے کہ یہ سب سے قدیم یورپی ماخذ ہے۔ قابل قدر ہے۔

نی بور اور اس کے رفقا[۱] ۱۷۶۱ء میں ڈنمارک سے روانہ ہوئے اور ۱۷۶۲ء میں یمن پہنچے۔ لیکن چند مہینوں کے اندر اس کے رفقائے سفر سب فوت ہو گئے۔ صرف نی بور زندہ واپس ہوا (۱۷۶۵ء) اس کا سفرنامہ عرب اور خاص کر یمن کے جغرافی، معاشرتی اور اقتصادی حالات کے متعلق ایک اہم تاریخی اور جغرافی دستاویز ہے۔ اکثر مؤرخوں نے اس کے دقت نظر اور صحتِ بیان کی تعریف کی ہے[۲]۔

نی بور خود نجد نہیں جا سکا تھا، اس لیے سنی سنائی باتوں پر اعتماد کی وجہ سے اس کا بیان فاش غلطیوں سے پاک نہیں رہ سکا ہے۔ اس کے بیان کی قیمت اس لیے بھی ہے کہ شیخؒ کی زندگی میں بلادِ عرب پہنچا اور ایسے وقت کہ ابھی دعوت خوب پھیل بھی نہ سکی تھی۔ ریاض کی فتح ۱۱۸۷ھ/۱۷۷۳ء میں ہوئی اور اس سے پہلے شیخؒ کا حلقۂ اثر محدود تھا۔ ہمارے پیش نظر نی بور کے سفرنامہ کا انگریزی ترجمہ ہے، مترجم کا نام (ROBERT HERON) ہے۔ (مطبوعہ ایڈنبرا: ۱۷۹۲ء)

---

[۱] نی بور کے رفیقوں میں ایک جرمن عالم راتھن بھی تھا۔ امیر شکیب نے اس کے پوتے سے ملاقات کا ذکر کیا ہے۔ (ایضاً)۔ [۲] ہوگارتھ: ص ۴۷ - ۶۷ بلادِ عرب کے یورپی سیاحوں پر ڈاکٹر شیخ عنایت اللہ صاحب (لاہور) کا بھی ایک مختصر لیکن فاضلانہ مقالہ اورینٹل کالج میگزین لاہور میں نکلا تھا (اورینٹل کالج میگزین۔ مئی ۱۹۳۷ء: اگست ۱۹۳۷ء دیارِ عرب کے مغربی سیاح)، اور حقیقت میں سب سے پہلے اسی مقالے نے مغربی سیاحوں کے سفرناموں کی طرف میری توجہ مبذول کرائی۔ اس کے بعد پروفیسر ہوگارتھ کی کتاب سے مزید روشنی ملی۔ جس کا ذکر آگے آتا ہے۔ فلبی ص ۲۶۰ نے بھی نی بور کی اوّلیت اور اہمیت کا ذکر کیا ہے۔

(۲۰) بادیا (BADIA) جو علی بیگ عباسی کے نام سے ۱۸۰۷ء میں جدہ اترا اور مکہ مکرمہ کی زیارت کی۔ مدینہ منورہ جانے سے اسے نجدی حکام نے روک دیا تھا۔ یہ پہلا یورپی سیاح ہے جس نے وہابی نجد اور اس کے پایۂ تخت درعیہ کے متعلق کچھ معلومات بہم پہنچائیں۔ اس کے سفرنامے کا تاریخی حصہ اس لحاظ سے نہایت اہم ہے کہ اس نے حجاز میں مصریوں کی مداخلت سے پہلے وہابیوں کی حکومت کے متعلق جو کچھ لکھا ہے وہ ایک عینی شاہد کی معاصرانہ شہادت کا درجہ رکھتا ہے۔ افسوس کہ اس کا سفرنامہ ہمیں دستیاب نہ ہو سکا۔ ہم نے جہاں کہیں بھی اس کی شہادت نقل کی ہے، ہوگارتھ[۱] کے واسطہ سے۔

(۲۱) برک ہارٹ کی کتاب NOTES ON THE BEDOUINS AND THE WAHHABYS ج ۲ ص ۳۲۹-۹۵۔

یہ مغربی سیاح ۱۸۱۴ء میں حجاز پہنچا۔ جب محمد علی پاشا نجدیوں کو حجاز سے بیدخل کرنے میں کامیاب ہو چکا تھا اور ۱۸۱۶ء میں مصر واپس ہوا، جہاں وہ تھوڑے عرصے کے بعد فوت ہو گیا۔ اس نے نجد، درعیہ اور بلاد عارض کا مفصل اور محققانہ جغرافیہ دیا ہے، اس نے اپنے سفرنامے کی پہلی جلدوں TRAVELS IN ARABIA میں مکہ معظمہ اور حج وغیرہ کی جو تفصیل کی ہے وہ اپنی جگہ پر نہایت مستند ہے۔ مکہ مکرمہ کے نظام حکومت پر بھی اس کی بحث عالمانہ ہے۔ رچرڈ[۲] برٹن جس[۳] نے ۱۸۵۰ء کے بعد مکہ مکرمہ کا سفر کیا، برک ہارٹ کا ثناخواں ہے اور انتہائی ادعائے تحقیق کے باوجود برک ہارٹ کے بیانات پر کوئی قابلِ ذکر اضافہ نہ کر سکا۔[۴]

---

[۱] (PENETRATION OF ARABIA) ص ۸۲-۷۹

[۲] TRAVELS ETC. ۱، ۳۴۴-۴۰۵۔

[۳] کپتان سر رچرڈ برٹن (R. F. BURTON) جس نے برک ہارٹ کے تقریباً چالیس برس بعد حجاز کا سفر کیا۔ لیکن اہل نجد کے متعلق کوئی اہم بات نہیں لکھی۔ اس کے سفرنامہ کا ایک خاص ایڈیشن دو جلدوں میں بڑے آب و تاب سے چھپا ہے۔ (لندن: ۱۸۹۳ء) [۴] ہوگارتھ: ص ۹۰-۸۹

اس کے سفر نامے کی پہلی دو جلدیں ۱۸۲۹ء میں چھپیں اور آخری دو جلدیں دو (Notes الخ)
۱۸۳۱ء میں شائع ہوئیں۔ یہ چاروں جلدیں عرب اور اس کے جغرافیہ و متعلقات پر معلومات
کا گنجینہ ہیں۔ ہمیں اس کتاب میں صرف (NOTES ON ETC) کی دوسری جلد سے بحث تھی
محمد علی مصری کے حملہ حجاز اور مصر و نجد کی لڑائیوں پر اس کے بیانات حد درجہ مستند اور عینی شہادت
کا درجہ رکھتے ہیں۔

(۲۲) HARFORD JONES BRYDGES کی کتاب A BRIEF HISTORY OF THE WAHHABYS.

یہ شخص ایک برطانوی افسر کی حیثیت سے ۱۷۸۴ء میں بصرہ پہنچا اور ۱۷۹۴ء تک وہیں
رہا۔ درمیان میں کچھ وقفہ کے بعد پھر بغداد میں اس کی تعیناتی ہوئی جہاں ۱۷۹۷ء سے ۱۸۰۶ء
تک اس کا قیام رہا۔ دونوں جگہوں میں یہ پولیٹیکل ایجنٹ کی حیثیت سے تھا اور سعود بن عبد العزیز
کے ساتھ اس کے تعلقات اچھے تھے۔ اس تفصیل سے یہ بات واضح ہوئی کہ براجس شیخ الاسلام
کی زندگی ہی میں بلاد عرب آ گیا تھا اور سعود بن عبد العزیز کے اہم فتوحات کے زمانہ میں وہاں موجود
تھا۔ اس لحاظ سے اس کی کتاب کی اہمیت اور تاریخی قیمت ہونا چاہیئے مگر افسوس کہ اس
میں دقت نظر نہیں۔ جا بجا برک ہارٹ کی حرف بہ حرف نقالی کرتا ہے جو اس کے بعد حجاز آیا
اور پہلے مرا۔

یہ کتاب ۱۸۳۴ء میں لندن سے شائع ہوئی اور برک ہارٹ کی کتابیں ۱۸۲۹ء اور ۱۸۳۱ء
میں نکل چکی تھیں۔ خود بھی اسے برک ہارٹ کی خوشہ چینی کا اعتراف ہے کہیں کہیں اس نے اضافہ بھی کیا ہے[۱]

---

[۱] برک ہارٹ کا مرقع ۱۸۱۶ء کے وسط پر ختم ہو جاتا ہے۔ براجس نے ایک اہم اضافہ یہ کیا ہے کہ اس
نے محاصرہ درعیہ (۱۸۱۸ء) کی پوری تفصیل فرانسیسی مؤرخ (M. MENGIN) کی تاریخ (HISTORY
DE L'EGYPT SOUS LE GOVENMENT DE MOHAMMED ALY) (مصر کی تاریخ
محمد علی کے عہد حکومت میں) سے حرف بہ حرف نقل کر دی ہے (ص ۱۶۱ - ۱۳۵)

لیکن اہم واقعات حرف بہ حرف برک ہارٹ ہی سے لیے ہیں۔

(۲۳) پالگریو (W. GIFFORD PALRAVE) کا سفر نامہ

(NARRATIVE OF A YEAR'S JOURNEY THROUGH CENTRAL AND EASTERN ARABIA)

یہ ایک کیتھولک عیسائی اور شہری زندگی کا عادی اور طبعاً ایک آرام پسند شخص تھا ۱۸۶۲-۳ء میں اس نے عرب کی سیاحت کی۔ اس نے حضری عربوں (احسا، قطیف وغیرہ کے باشندے) کی خوب تعریفیں کی ہیں لیکن اہل بادیہ کی ہمدردی کے لیے اس کے پاس ایک لفظ نہیں۔ اس نے اہل نجد، شیخ محمد بن عبد الوہابؒ اور ان کے ماننے والوں کی برائیاں کی ہیں زویمر (حاشیہ ۱۹۸) اور ہیوجس (ص ۵۰ ب) کی رائے میں وہابیت کی برائی میں اس کی "کیتھولکیت" کو بھی دخل تھا۔ زویمر کی رائے میں زیادہ سے زیادہ ۱۸۶۲-۳ء کے واقعات میں اس کے بیان پر اعتماد کیا جا سکتا ہے لیکن ہمارے خیال میں کسی مسئلہ کے متعلق صرف اس کے بیان پر فیصلہ نہیں کیا جا سکتا۔ شیخ پر اس نے جو کچھ لکھا ہے خرافات کا مجموعہ ہے (ص ۳۸-۳۶۳)، آل سعود کی تاریخ بھی (ص ۸۷-۳۸) اسماء اور تاریخوں کی فاحش غلطیوں سے پُر ہے۔ ہیوجس نے خوب لکھا ہے کہ "اس کے بیانات دلچسپ لیکن ناقابل اعتماد ہیں۔ زویمر کہتا ہے:

"ایک کیتھولک سے یہ امید نہیں کی جا سکتی کہ وہ تجدید اور سلفیت کی دعوت کا ذکر اچھے انداز میں کرے گا"۔ نفس اسلام کے متعلق اس نے جو ہرزہ سرائیاں کی ہیں وہ انتہائی رکیک اور یکسر ناقابل اعتنا ہیں ــــ حد تو یہ ہے کہ وہ اپنے معاصروں کی نشاندہی بھی صحیح نہیں کر سکا۔ شیخ عبد الرحمٰن بن حسن بن عبد الوہاب کو عبد الرحمٰن بن عبد الوہاب اور ان کے بیٹے عبد اللطیف بن عبد الرحمٰن بن حسن کو عبد الرحمٰن بن عبد اللہ کا بیٹا بتاتا ہے (ص ۳۷۹) اور مزید یہ کہ "عبد اللہ بن عبد الوہاب (۹) درعیہ میں ابراہیم پاشا کے حکم سے قتل کر دیئے گئے تھے"۔ طرہ یہ ہے کہ وہ ریاض میں

۱؎ NOTES ETC ص ۲۲۱ ۲؎ حاشیہ: ص ۹۸۔

شیخ عبد الرحمٰن سے ملا بھی تھا، اس کا سفر نامہ دو جلدوں میں چھپا ہے۔ (۱۸۶۵ء)

(۲۴) یوس پلی کی - (A POLITICAL MISSION TO NEJD) یہ شخص بوشہر میں برطانی ریزیڈنٹ تھا۔ ۱۸۶۵ء میں فیصل بن ترکی (ف ۱۸۶۵ء / ۱۲۸۲ء) سے خلیج فارس کے ساحلی مقامات کے متعلق گفتگو کرنے کے لیے ریاض آیا ہمیں اس کی کتاب نہ مل سکی۔ ممکن ہے اس میں کچھ مواد ہو، ہیوجس نے اپنے ماخذ میں اس کی کتاب کا بھی ذکر کیا ہے۔ ہوگارتھ نے پلوس پلی کے مشن پر کافی بحث کی ہے اور اس نے سفر کی جغرافی قیمت کی طرف بھی اشارہ کیا ہے۔ لیکن اس کی تاریخی تحقیقات کا بالکل ذکر نہیں کیا۔

(۲۵) بیجر (G. PERCY BEDGER) کی (IMAMS AND SYEDS OF OSMAN) یہ کتاب اصل میں ایک عربی مخطوطہ (مصنفہ سلیل بن رزیق) کا ترجمہ ہے جس میں عمان کے امراء کی پوری تاریخ مفصل بیان کی گئی ہے (آغاز اسلام سے ۱۸۵۶ء تک) بیجر نے انگریزی ترجمے میں حواشی اور ایک مبسوط مقدمہ کا اضافہ کیا ہے جس میں کتاب کے پورے مواد پر بحث ہے اور عمان کی تاریخ بھی ۱۸۷۰ء تک مکمل کردی گئی ہے۔

چونکہ آل سعود کی دعوت اور سیاسی عروج دونوں کا خلیج فارس اور جزیرہ نمائے عرب کے تمام ساحلی علاقوں سے گہرا تعلق رہا ہے۔ اس لیے ان کی تاریخ بھی جابجا زیر بحث آئی ہے بیجر کے حاشیے عام طور پر معلومات اور اچھے ہیں البتہ نجد کے متعلق وہ پالگریو پر زیادہ اعتماد کرتا ہے آل سعود کے متعلق چونکہ زیادہ تر معلومات سیاسی نزاعوں اور حملوں کی تفصیل سے متعلق ہیں، اس لیے زیر نظر تالیف میں زیادہ فائدہ نہیں اٹھایا جا سکا۔ (مطبوعہ لندن: ۱۸۷۱ء)

(۲۶) ڈاوٹی (DAUGHTY) پالگریو کے تیرہ برس بعد ۱۸۷۵ء میں نجد آیا بدوؤں کی معاشرت کی تفصیل جغرافی اور لسانی تحقیقات کے لحاظ سے اس کے سفرنامے کی جو بھی قیمت ہو اہل نجد کی تاریخ پر اس نے کوئی خاص مسالہ نہیں چھوڑا، سوائے اس پیش گوئی کے:-

---

[1] ص ۳۱ - ۳۰۸ -

"وہابی حکومت موت کے قریب پہنچ گئی ہے اور اب دوبارہ اس میں جان نہیں آسکتی ...... عام طور پر نجد میں یہی خیال ہے۔[1]

واقعات و مشاہدات نے اس خام خیالی کی تکذیب کر دی۔ اس کا سفرنامہ TRAVELS IN ARABIA DESERTA. دو جلدوں میں ہے (۱۸۸۶ء اور ۱۹۲۱ء)

(۲۷) لیڈی این بلنٹ (ANNE BLUNB) کا سفر نامہ A PILGRIMAGE TO NEJD) : مشہور سیاسی مدبر اور شاعر ولفرڈ سکاون بلنٹ۔ WILFRID SCAWN BLUNT اور ان کی بیگم لیڈی بلنٹ (جو مشہور شاعر بائرن کی پوتی تھیں) نے غالباً اچھے گھوڑوں کی تلاش میں عرب اور نجد کی سیاحت کی تھی: (۱۸۷۹ء) لیڈی بلنٹ کے سفرنامے سے ہمارے موضوع کا تعلق نہیں۔ دیباچہ اور ضمیمہ جو خود ولفرڈ بلنٹ نے لکھا ہے ان میں نجد کے جغرافیہ دیباچہ (I-XVIII) اور وہابیت کا عروج و زوال کا ایک خاکہ پیش کیا گیا ہے۔ (۲: ۲۷۱ - ۲۵۱) گو غلطیاں کافی ہیں پھر بھی ایک "خاکہ" کی حد تک غنیمت ہے۔ کتاب میں جہاں کہیں بلنٹ کا حوالہ آیا ہے، یہی ضمیمہ مراد ہے۔ اصل سفرنامہ دو جلدوں میں چھپا ہے (لندن ۱۸۸۱ء)

ولفرڈ بلنٹ کی "فیوچر آف اسلام" (ص ۴۶ - ۴۲، ۱۰۶) میں بھی شیخ کی دعوت کا ذکر آیا ہے۔ مختصر سے بیان میں بھی متعدد غلطیوں اور غلط فہمیوں کے نمونے ملتے ہیں جن کی طرف غلط بیانیوں کے ضمن میں اشارہ نہیں کیا جا سکا۔ اس کا اگر کہیں حوالہ آیا ہے تو کتاب کی تصریح کے ساتھ ۱۸۸۲ء کا چھپا ہوا نسخہ ہمارے سامنے رہا ہے۔

(۲۸) ہیوجس (THOMAS P. HUGHES) کی ڈکشنری آف اسلام[2] (DICTIONARY OF ISLAM)

اس پروٹسٹنٹ مشنری کا یہ مقالہ کتنے مسلمان عالموں کی تحریروں سے بہتر ہے۔ جہاں

---

[1] ۲: ۴۲۵ [2] مقالہ وہابی (ص ۶۶۲ - ۶۵۹)

تک دعوت کے منشار کا تعلق ہے، اس نے سمجھنے میں غلطی نہیں کی اور اس نے شیخ کی تعلیمات کا بہت اچھا خلاصہ دیا ہے۔ تاریخی فروگزاشتیں ہیں سو وہ صد فیصد برا جس اور برنٹ کا ——

اس کتاب میں جہاں کہیں ہیوجس (HUGHES) کا حوالہ ہے یہی مقالہ مراد ہے۔ (نسخہ مطبوعہ لندن: ۱۸۸۵ء)

(۲۹) ہیوجس کا دوسرا مقالہ (THE WAHHABI) اس کی مختصر کتاب (NOTES ON MOHAMMADANISM) میں (ص ۲۲۶-۲۱۹) —— اس میں عام عقائد وغیرہ کے علاوہ سلاطین آل سعود کی بھی ایک مکمل فہرست دی گئی ہے۔ (۱۸۷۵ء تک) اس مختصر مقالے میں ڈکشنری آف اسلام والے مقالے (WAHABIA) پر کچھ مفید اضافے بھی ہیں، بخاص کر ہندوستانی مجاہدین کے متعلق جن پر گفتگو کا یہاں موقع نہیں۔ اس مقالے کا جہاں حوالہ آیا ہے۔ نوٹس کی تصریح کے ساتھ۔ (نسخہ مطبوعہ لندن ۱۸۷۷ء)

(۳۰) زویمر (ZWEMER) کی (ARABIA, THE CRADLE OF ISLAM) ص ۲۰۱ - ۱۹۱ -

زویمر نے اپنے تعصب کے باوجود شیخ کی دعوت کو سمجھنے کی کوشش کی ہے اور اس تحریک سے قبل عرب کی حالت کا بھی جائزہ لیا ہے (ص ۳-۱۹۲) اپنی کتاب کے اس باب میں اس نے صرف تین تاریخی غلطیاں کی ہیں۔

(۱- سنہ ولادت: ۱۶۹۱ء، ۲- سفر بغداد، ۳- ہدم قبہ رسول) لیکن استنتاج میں اس کا تعصب غالب رہا، ارشاد ہوتا ہے:-

"یہ تحریک اسلام کی تجدید تھی گو بالکل ناکامی (DISASTER) پر ختم ہوئی اور سیاسی طور پر ایک شاندار ڈھونگ ثابت ہوئی۔" ص ۱۹۱۰۲ - (دوسرا ایڈیشن ۱۹۱۰ء)

(۳۱) ہوگارتھ (DAVID GEORGE HOGARTH) کی (THE PENETRATION OF ARABIA)

ہوگارتھ نے اس کتاب میں ان تمام یورپی سیاحوں کی کوششوں کا مفصل اور گہرا جائزہ لیا ہے، جنھوں نے گزشتہ تین صدیوں میں بلادِ عرب کی سیاحت کی اور وہاں کے جغرافیہ، تاریخ، اثریات، معاشرت، آداب و رسوم وغیرہ کے متعلق کوئی تحریری دستاویز یادگار چھوڑی۔ اس سلسلے میں ان سیاحوں کے کارناموں پر بھی پورا پورا تبصرہ ہوا ہے، جنھوں نے شیخ اور ان کے جانشینوں کے ایامِ حکومت میں بلادِ نجد و حجاز کی سیاحت کی۔ ہم نے ہوگارتھ کے مختلف بیانوں کا اصل سفرناموں سے بارہا مقابلہ کیا، لیکن اس کے نقل اور تبصرے میں کہیں ادنیٰ فروگزاشت نہیں پائی اور اس لیے اصل سفرناموں کی عدمِ موجودگی میں اس کے خلاصے اور تبصرے سے بھی فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔ (مطبوعہ: لندن ۱۹۰۴ء)

اس کتاب میں جہاں کہیں ہوگارتھ کا حوالہ ہے، یہی زیرِ نظر کتاب مراد ہے۔

ہوگارتھ کی ایک دوسری مختصر (A HISTORY OF ARABIA) میں بھی اشرافِ مکہ (ص ۹۳ - ۸۲) اور وہابی اور مصری (ص ۱۱۳ - ۹۹) پر دو باب ہیں مگر حیرت ہوتی ہے کہ یہاں وہ محمد بن سعود، عبد العزیز بن محمد بن سعود اور سعود بن عبد العزیز کے درمیان ٹھیک ٹھیک فرق نہ کر سکا۔ (ص ۱۰۳)

(۳۲) فلبی (H. ST. J. B. PHILBY) کی کتاب (ARABIA) مطبوعہ لندن: ۱۹۳۰ء۔

فلبی نے اس کتاب میں شیخ کی دعوت سے لے کر موجودہ سلطانِ نجد عبد العزیز بن عبد الرحمٰن بن فیصل بن ترکی بن عبد اللہ بن محمد بن سعود (۱۹۰۰ء ——) تک نجد کی پوری تاریخ لکھی ہے۔ شیخ کی سیرت اور دعوت کا حصہ بکسر ابن غنام اور ابن بشر سے ماخوذ ہے۔ کتاب ہر لحاظ سے مفید اور قیمتی معلومات کی حامل ہے اور ہم نے اس سے کافی فائدہ اٹھایا ہے لیکن اصل ماخذ کو سامنے

لہ فلبی نے خود بھی دیباچہ (ص) میں لکھا ہے کہ یہ پہلی کتاب ہے جو اصل ماخذ کی بنیاد پر انگریزی میں مرتب ہوئی ہے اور اس کا لکھنا صحیح ہے۔ شیخ کے متعلق غالباً کسی مغربی زبان میں اتنی معلومات یکجا نہیں مل سکتیں۔

رکھ کر اس کتاب کا ایک دوسرا پہلو بھی ہے مصنف کا مقصد یہ ہے کہ بلاد عرب میں حکومت برطانیہ کو ایک "عصائے پیری" کی ضرورت ہے اور اس کے لیے موجودہ فرمانروائے نجد زیادہ موزوں ہیں۔ شریف حسین کی امداد اور ابن سعود سے بے اعتنائی پر اس نے وائٹ ہال حکومت بصرہ و بغداد پر سخت تنقیدیں کی ہیں، خلاصہ یہ کہ جزیرۃ العرب میں برطانی ڈپلومیسی پر یہ کتاب کافی روشنی ڈالتی ہے لیکن اس وقت ہمیں اس رخ سے سروست کوئی تعلق نہیں۔

(۳۳) ماردتمان (MORDTMAN) کے مقالے (ابن سعود اور ابن الرشید (مندرجہ انسائیکلوپیڈیا آف اسلام)

جرمن مستشرق، ماردتمان کے یہ مقالے اختصار کے باوجود جامع اور بڑی حد تک صحیح ہیں سنین اور تاریخوں کی تعیین کی کوشش قابل تحسین ہے۔ اس سے پہلے تاریخوں کی ٹھیک ٹھیک تعیین اور ہجری اور عیسوی سنین کی تطبیق کا کسی نے التزام نہیں کیا۔ ہمیں کہیں کہیں اس سے اختلاف کرنا پڑا ہے لیکن ابن سعود والے مقالے سے مدد بھی ملی۔

(۳۴) مارگولیوتھ (D. S. MARGOLIOUTH) کے دو مقالے:۔

(i) : (WAHHABIYAH) (انسائیکلوپیڈیا آف اسلام)

(ii) وہابی (WAHHABIES) (انسائیکلوپیڈیا آف ریلیجنز) اینڈ اتھکس)

دونوں مقالے غلطیوں سے بھرے ہوئے ہیں، غلطیاں تو ہر کسی سے ہوتی ہیں لیکن ان صاحب کی ادا نرالی ہے۔ جہل مرکب اور غلطیوں کا انبار اتنا اور کہیں نہیں ملے گا۔ اس کتاب میں جہاں صرف مارگولیوتھ کا حوالہ آیا ہے، پہلے مقالے کی طرف اشارہ ہے۔

(۳۵) راونشا (T. E RAVENSHAW) کی یادداشت۔

(MEMORANDUM) گو اس یادداشت کا تعلق مولانا احمد اللہ صادق پوریؒ (ف ۱۲۹۸ھ) کے مقدمے اور ہندوستانی مجاہدین کی تحریک تجدید و جہاد سے ہے بایں ہمہ اس میں شیخ محمد بن عبد الوہابؒ اور ان کی دعوت کے متعلق بھی خوب غلط بیانیاں کی گئی ہیں، جس کا

ایک نمونہ گزر چکا (ملاحظہ ہو اس کتاب کا پانچواں باب) ـــــ یہ یادداشت پوری کی پوری کلکتہ گزٹ ۲۰ ستمبر ۱۸۶۵ء کے ضمیمے کی حیثیت سے چھپی ہے۔

(۳۶) ولیم ولسن ہنٹر (W. W. HUNTER) کی (THE INDIAN MUSALMANS) مسلمانانِ ہند (مطبوعہ: ۱۸۷۱ء[1])

اس کتاب کا تعلق بھی ہندوستانی مجاہدین کی سرگرمیوں سے ہے، چونکہ یہ حضرات ہندوستان کی تحریک تجدید و امامت کو شیخ الاسلام رح ہی کی دعوت کا شاخسانہ بتاتے ہیں اس لیے خواہ مخواہ انہیں شیخ کی دعوت پر بھی گفتگو کرنا پڑتی ہے[2]۔ اس سلسلہ میں ہنٹر صاحب نے بھی اپنی ناواقفیت کا خوب خوب ثبوت دیا ہے[3]۔ کچھ نمونے اوپر گزر چکے ہیں۔ ان "غلط بیانیوں" میں اس کا ماخذ زیادہ تر راونشا کی یادداشت رہی ہے۔ گو یہ حوالہ نہیں دیتا۔

(۳۷) (ANDRE SERVIER) کی (ISLAM AND PSYCHOLOGY OF THE MUSALMANS) (اصل فرینچ کا ترجمہ: لندن ۱۹۲۴ء)

ان صاحب نے محمد بن عبد الوہاب رح اور ان کی جماعت کو جی بھر کر گالیاں دی ہیں اور یوں تو نفسِ اسلام ہی ان کے نزدیک "انسانیت کی ہر ترقی کا دشمن" ہے۔ (ص ۲۶۴) پالگریو ان کا ماخذ معلوم ہوتا ہے۔

---

[1] اب یہ کتاب دوبارہ چھپ گئی ہے۔ نظر ثانی کے بعد یہی نسخہ ہمارے سامنے ہے (کلکتہ ۱۹۴۵ء)، [2] اس سلسلہ میں ہم نے جتنی کتابوں اور مقالوں کا ذکر کیا ہے، ان سب میں نجد اور ہندوستان کی تحریکوں کو ایک بتایا گیا ہے بعض صرف اصول کی حد تک ایک بتاتے ہیں اور اکثر حضرت سید احمد شہید رح کی تحریک جہاد و تجدید کو شیخ محمد بن عبد الوہاب رح کی دعوت کی شاخ بتاتے ہیں جو یکسر غلط ہے۔ (تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: راقم کی "ہندوستان کی پہلی اسلامی تحریک")

[3] خاص طور پر ملاحظہ ہو: ص ۱۱ اور اس سے آگے (نیا ایڈیشن)

(۳۸) (WILSON CASH) کی (THE EXPANSION OF ISLAM)

(مطبوعہ لندن ۱۹۲۸ء)

ان صاحب کا خیال ہے کہ محمد بن عبد الوہابؒ "عربی اسلام" چاہتے تھے۔ (ص ۱۹۱) اس قسم کی غلط فہمیوں اور غلط بیانیوں کی کمی نہیں —— ان دونوں کتابوں میں بھی شیخؒ کی دعوت کا ذکر ضمنی طور پر آیا ہے۔

(۳۹) رچرڈ کوک (RICHARD COKE) کی (THE ARAB'S PLACE

IN THE SUN) (ص ۱۴۰ - ۱۶۱)

دعوت پر ایک اچھا مختصر تبصرہ ہے۔ غلطیاں بعض عام قسم کی ہیں اور بعض ناموں کے الٹ پھیر سے ہوئی ہیں، سعود بن عبد العزیز کے کارناموں کو یہ عبد العزیز کی طرف منسوب کرتا ہے (ص ۱۶۲) اور عبد اللہ بن سعود اور سعود بن عبد العزیز کے درمیان بھی ٹھیک فرق نہیں کر پاتا۔ (ص ۱۶۳)

(۳۳ سے ۳۹ تک جن کتابوں کا ذکر کیا گیا ان کی حیثیت آخذ کی نہیں بلکہ عام لٹریچر ہے۔ یہ فہرست اور طویل ہو سکتی تھی، لیکن اختصار کے خیال سے اتنے ہی پر اکتفا کرنا پڑا۔ بعض کتابوں کے ضمنی حوالے اصل کتاب میں آ گئے ہیں، جیسے اسٹاڈرڈ (LOTHROP STODDARD) کی جدید دنیائے اسلام (THE NEW WORLD OF ISLAM) وغیرہ

(۲) مذہبی

(الف)

توحید اور انکار بدعات پر سینکڑوں، ہزاروں کتابیں لکھی گئی ہوں گی اور ان کا استقصا مشکل بھی ہے۔ خاص طور پر امام ابن تیمیہؒ (ف ۷۲۸ھ) اور ان کے شاگرد رشید امام ابن قیمؒ (ف ۷۵۱ھ) کی کتابیں ان مباحث سے بھری پڑی ہیں۔ ہم یہاں صرف ان کتابوں کا ذکر

کرتے ہیں جن کے مطالعہ کا اس دوران میں ہمیں موقع ملا اور شیخ کی دعوت کے سمجھنے میں ان سے مدد ملی :-

(۱) "الباعث علی انکار البدع والحوادث" لابی محمد عبد الرحمٰن بن اسمٰعیل بن ابراہیم ابی شامۃ المغربی (ف ۶۶۵ھ) (مطبوعہ مصر : ۱۳۱۰ھ)

(۲) "تجرید التوحید المفید" للشیخ تقی الدین احمد بن علی المقریزی (ف ۸۵۴ھ)
(مصر : ۱۳۴۲ھ)

(۳) "تطہیر الاعتقاد عن ادران الالحاد" لمحمد بن اسمٰعیل الامیر الیمنی الصنعانی (ف ۱۱۸۲ھ)
(مصر : ۱۳۴۰ھ)

(۴) "کتاب التوحید" لمحمد بن عبد الوہاب (ف ۱۲۰۶ھ)
(مطبوعہ : ۱۳۴۴ھ مع تعلیقات استاذ محترم ڈاکٹر تقی الدین ہلالی مراکشی)
اور شیخ کی دوسری تصنیفیں اور رسالے۔

(۵) "الدر النضید فی اخلاص کلمۃ التوحید" لمحمد بن علی الشوکانی (ف ۱۲۵۰ھ)
اس کا اردو ترجمہ بھی مولوی محمد علی صاحب قصوری ایم۔ اے کے قلم سے چھپ گیا ہے (۱۹۲۴ء)

(۶) "التحف فی مذاہب السلف" الشوکانی رح۔ مصر : ۱۳۱۰ھ)

(۷) "مجموعۃ الہدیۃ السنیۃ والتحفۃ الوہابیۃ النجدیۃ" : مرتبہ سلیمان بن سحمان نجدی۔
اس مجموعہ کے مرتب نجد کے مشہور علماء میں شمار کیے جاتے تھے۔ شیخ عبد الرحمٰن بن حسن آل الشیخ (ف ۱۲۸۵ھ) اور شیخ عبد اللطیف بن عبد الرحمٰن بن حسن (ف ۱۳۰۴ھ) دونوں سے استفادہ کیا۔ چھیاسی سال کی عمر میں وفات پائی (۱۳۵۸ھ) بروایت شیخ عمران نجدی)
اس مجموعے میں حسب ذیل رسالے ہیں :-
(الف) "الرسالۃ الدینیۃ فی معنی الالٰہیۃ" (ص ۳-۲۸) للامیر عبد العزیز بن محمد بن سعود (ف ۱۲۱۸ھ)

(ب) "شیئ من سیرۃ الشیخ و تعالیمہ" (ص ۴۰ - ۲۸) للشیخ عبد اللطیف بن عبد الرحمٰن آل الشیخ (ف ۱۳۰۴ھ)

(ج) "الرسالۃ الثالثۃ" (ص ۵۵ - ۴۱) للشیخ عبد اللہ بن محمد بن عبد الوہاب رح۔

یہ رسالہ ۱۲۱۸ھ میں اہل مکہ مکرمہ کی تعلیم کے لیے لکھا گیا۔ جب سعود بن عبد العزیز پہلی مرتبہ حرم میں فاتحانہ داخل ہوا۔

(د) "الفواکہ العذاب فی الرد علی من لم یحکم بالسنۃ والکتاب" (ص ۹۰ - ۵۵) للشیخ احمد بن ناصر بن عثمان العمری النجدی (ف ۱۲۲۵ھ)

یہ رسالہ ۱۲۱۱ھ میں تالیف ہوا، جب شیخ احمد بن ناصر امیر عبد العزیز کی طرف سے حجاز بھیجے گئے اور رجب ۱۲۱۱ھ میں علمائے حرم سے مناظرہ ہوا۔

(ھ) "الرسالۃ الخامسۃ" (ص ۹۹ - ۹۱) للشیخ محمد بن عبد اللطیف بن عبد الرحمٰن آل الشیخ

یہ رسالہ ۱۳۳۹ھ میں تالیف ہوا۔ مصنف بقید حیات ہیں عمر اسی کے لگ بھگ ہوگی۔ (بہ روایت شیخ عمران نجدی)

ان رسالوں کا ترجمہ اردو میں ہوگیا ہے (از مولوی اسمٰعیل صاحب غزنوی) ۲۷ء)

آخر میں کچھ قصیدے ہیں (ص ۱۱۲ - ۱۰۱)

(۸) "فتح المجید شرح کتاب التوحید" و تالیف الشیخ عبد الرحمٰن بن حسن آل الشیخ (طبع سوم: قاہرہ ۱۳۵۷ھ)

(۹) "جلاء العینین فی محاکمۃ الاحمدین: شیخ خیر الدین آلوسی (ف ۱۳۱۷ھ) (بولاق: ۱۲۹۸ھ)

یہ کتاب مجھے بہت مفید اور جامع معلوم ہوئی اور اسی لیے میں نے اسے بار بار پڑھا۔

لہ اس کا انگریزی ترجمہ اوکنلی (J.O' KINELY) کے قلم سے جنرل ایشیاٹک سوسائٹی (۱۸۷۴ء ص ۸۲ - ۶۸) میں شائع ہوا ہے (ترجمہ میں بعض مضحکہ انگیز غلطیاں بھی ہیں جیسے الامہات الستۃ (حدیث کی چھ اہم کتابیں: صحاح ستہ کا ترجمہ اس نے (SIX MOTHERS) کیا ہے۔ ص ۷۴ - وغیرہ وغیرہ۔

علامہ سید رشید رضا مرحوم (ف ۱۳۵۲ھ) نے بھی اپنی خود نوشت سوانح حیات میں اس کی بہت تعریف کی ہے (ملاحظہ ہو: معارف: نومبر۔ دسمبر ۱۹۳۸ء)۔

(۱۰) "الانتقاد الرجیح فی شرح الاعتقاد الصحیح" للنواب صدیق حسن خان (ف ۱۳۰۷ھ) (بولاق: ۱۲۹۸ھ، علی ہامش جلاء العینین)

(۱۱) "تنبیہ ذوی الالباب السلیمۃ عن الوقوع فی الالفاظ المبتدعۃ الوخیمۃ": لسلیمان بن سحمان النجدی (ص ۸۰-۱)

(۱۲) "تبرئۃ الشیخین الامامین من تزویر اہل الکذب والمین": لسلیمان بن سحمان (ص ۸۲-۲۱۵)

یہ دونوں رسالے ایک ساتھ چھپے ہیں۔ (مصر: ۱۳۴۲ھ)

(ب)

(۱۳) کتاب التوضیح عن توحید الاخلاق فی جواب اہل العراق للشیخ سلیمان بن عبد اللہ بن محمد بن عبد الوہاب (ش: ۱۲۳۳ھ) (مصر: ۱۳۱۹ھ)

(۱۴) منہاج التقدیس والتاسیس فی کشف شبہات داؤد بن جرجیس: للشیخ عبد اللطیف بن عبد الرحمٰن بن آل الشیخ (ف ۱۳۰۴ھ) (بمبئی: ۱۹۰۷ء)

یہ "صلح الاخوان" کا جواب ہے۔

(۱۵) "صیانۃ الانسان عن وسوسۃ الشیخ دحلان": للشیخ محمد بشیر السہسوانی (ف ۱۳۲۶ھ)

یہ کتاب عام طور پر مولانا محمد بشیر سہسوانی ہی کی طرف منسوب کی جاتی ہے۔ ہمارے پاس جو نسخہ ہے، اس پر مصنف کا نام عبد الرحمٰن بن عبد الرحمٰن بن عبد الرحیم السندی درج ہے۔ غالباً یہ کسی مصلحت سے کیا گیا تھا۔

(یہ وہی نسخہ ہے جو شیخ اسحٰق بن عبد الرحمٰن بن حسن کے استعمال میں رہا ہے)

(مطبع فاروقی دہلی: ۱۸۹۰ء)

---

۵۱ ملاحظہ ہو: متراجم علمائے حدیث ہند، ج اول، ص ۲۵۵

اس کا دوسرا ایڈیشن نہایت تصحیح و اہتمام سے المنار پریس مصر میں چھپا ہے (۱۳۵۱ھ) اور اصل مصنف کی طرح نسبت کی گئی ہے آغاز میں علامہ سید رشید رضا ف ۱۳۵۳ھ) کا مقدمہ اور تعارف ہے۔

(۱۶) "البیان المبدی لشناعۃ القول المجدی": لسلیمان بن سحمان النجدی "صیانۃ الانسان"، "دحلان" کے "الدرر السنیۃ" کا جواب ہے۔ جواب الجواب "القول المجدی فی الرد علی عبداللہ بن عبد الرحمٰن السندی" کے نام سے شائع ہوا۔ "البیان المبدی"، "القول المجدی" کی تردید میں ہے (امرتسر ۱۸۹۷ھ)

(۱۷) "الصواعق الالٰہیۃ فی الرد علی الوہابیۃ": لسلیمان بن عبد الوہاب النجدی الحنبلی (ف ۱۲۰۸ھ)

یہ رسالہ شیخ الاسلام کے بھائی سلیمان بن عبد الوہاب کا لکھا ہوا ہے۔ اوپر گزر چکا ہے کہ یہ بعد کو تائب ہو گئے تھے۔ (۱۱۹۰ھ ابن غنام: ۲، ۱۰۸)۔ مخالف اس رسالہ کا تو خوب ڈھول پیٹتے ہیں لیکن رجوع کا ذکر نہیں کرتے۔ کتاب کا یہ نام غالباً بعد کو رکھا گیا ہے اس لیے کہ سلیمان بن عبدالوہاب نے یہ رسالہ ۱۱۶۷ھ کے لگ بھگ ایک خط کی صورت میں لکھ کر اہل حریملا کے پاس بھیجا تھا، جس کا جواب بھی شیخ نے دیا تھا اور ۱۱۶۷ھ میں یہ نام (وہابیۃ) قطعی طور پر رائج نہیں ہوا تھا۔ (مطبوعہ مصر: ندارد[۱])

اصل رسالہ تو مختصر ہے لیکن اس میں کچھ ضمیمے لگا دیئے گئے ہیں اور یوسف دجوی وغیرہ کے لکھے ہوئے ہیں۔ یہ "ضمیمے" اکثر و بیشتر ابن سعود کے عروج کے بعد تالیف ہوئے ہیں۔

(۱۸) "*تکلم المتقلدین فی مدعی تجدید الدین": لمحمد بن عبد الرحمٰن بن عفالق الاحسائی (تقریباً ۱۱۷۰ھ)

---

[۱] روضۃ الافکار: ۲، ۲۳۔ ۵۲۔ [۲] ۲۸ھ کے بعد چھپی ہے۔ اتنا قطعی ہے۔

(۱۹) "الفصل الخطاب فی رد ضلالات ابن عبد الوہاب": لاحمد القبانی البصری (تقریباً ۱۱۵۷ھ)

(۲۰) "الصواعق والرعود": لعفیف الدین عبد اللہ بن داؤد الزبیری الحنبلی (ف ۱۲۲۵ھ) مخطوطہ مشرقی کتاب خانہ: ۱۲۳۸)

(۲۱) مصباح الانام وجلاء الظلام" للسید احمد عبد اللہ الحداد باللوی (مخطوطہ مشرقی کتاب خانہ ۱۲۵۸ء)

(۲۲)* "صلح الاخوان من اہل الایمان" و"بیان الدین القیم فی تبرئۃ ابن تیمیہ و ابن قیم" لداؤد بن سلیمان بن جرجلیس البغدادی (ف ۱۲۹۹ھ)

اسی کی تردید میں شیخ عبد اللطیف کی "منہاج التقدیس" لکھی گئی تھی (بمبئی ۱۳۰۵ھ) آلوسی (ف ۱۳۱۷ھ) نے بھی "جلاء العینین" (ص ۳۱۵) میں مصنف "صلح الاخوان" کی غلط فہمیوں کی طرف اشارہ کیا ہے۔

(۲۳) "الدرر السنیۃ فی الرد علی الوہابیۃ": السید احمد زینی دحلان (ف ۱۳۰۴ھ) یہ چھوٹا سا رسالہ ہے جو دحلان کی "خلاصۃ الکلام" میں پورا پورا آگیا ہے (ص ۲۶۱ - ۲۲۸) اس کے جواب میں مولانا محمد بشیر سہسوانیؒ نے "صیانۃ الانسان" لکھی اور پھر اس پر حضرمی نے "القول المجدی" تصنیف کی آخر میں سلیمان بن سحمان نے "البیان المبدی" لکھی۔ آخر دور میں یعنی گزشتہ ساٹھ ستر سالوں میں مفتی دحلان ہی کی کتابوں نے غلط بیانیوں کی زیادہ اشاعت کی ہے۔

لہ مؤلف مصباح الانام (جو تیرھویں صدی ہجری کے ایک عالم تھے) نے دیباچہ میں ایسی متعدد کتابوں کا ذکر کیا ہے جو شیخ کی تردید میں لکھی گئی تھیں لیکن ان کا ذکر کسی فہرست میں نہیں جیسے: (۱) "الصارم الهندی فی عنق النجدی" للشیخ عطاء المکی (۲) رسالہ للشیخ احمد المصری الاحسائی۔ "مصباح الانام" طبع ہو چکی ہے۔ بروکلمن: ۲، ۸۱۳) * جن کتابوں پر یہ علامت ہے وہ مجھے دستیاب نہ ہو سکیں۔

(د)

(۲۴) "فتح المنان فی ترجیح الراجح وتزییف الزائف من صلح الاخوان"[1] محمد بن ناصر الحازمی النجدی (ف ۱۲۸۳ھ)

یہ آخری کتاب بطور محاکمہ کے لکھی گئی ہے جیسا کہ کتاب کے نام اور "اتحاف" کے اقتباسات سے اندازہ ہوتا ہے۔

چونکہ ان میں سے اکثر کتابوں کا ذکر پہلے آچکا ہے، اس لیے ماخذ کے سلسلے میں مزید تبصرے کی ضرورت نہیں سمجھی گئی۔ یوں کافی چھان بین کی جائے تو یہ فہرست طویل ہو سکتی ہے[2]۔

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ٭

---

[1] اتحاف النبلاء: ص ۴۱۳

[2] ان کتابوں کے علاوہ ضمنی طور پر مندرجہ ذیل تذکروں نے بھی سنین وفات اور دوسری تفصیلات کی تعیین میں بڑی مدد دی:-

(i) "سلک الدرر فی اعیان القرن الثانی عشر" للمراوی

(ii) "السحب الوابلۃ علی ضرائح الحنابلۃ" (مخطوطہ مشرقی کتب خانہ) — اس کا مصنف بھی شیخ اور ان کی دعوت کی مذمت میں حدِ اعتدال سے بڑھا ہوا ہے۔

(iii) معجم المطبوعات (سرکیس) (iv) "الاعلام" للزرکلی (تین جلدیں)

(v) جرمن مستشرقین (C. BROCKELMANN) کی مشہور تاریخ ادب عربی (GESCHICHTE DER ARABISCHEN LITTERATURE (دو جلدیں: ۱۸۹۸ء ذیل کی دو جلدیں: ۱۹۳۸ء)

خاص کر ذیل کی دوسری جلد تو اس سلسلے میں اوڑھنا بچھونا رہی ہے۔

(۸) تقویم ہجری وعیسوی (انجمن ترقی اردو)

اقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِي خَلَقَ

فِيهَا كُتُبٌ قَيِّمَةٌ

طارق اکیڈمی لائل پور

تاریخ کا ایک ہولناک باب

کالا پانی

تصنیف: محمد جعفر تھانیسری

ترتیب تہذیب: محمد سرور طارق

کالا پانی ایک لرزہ خیز داستان، جس میں انسان کے ہاتھوں انسان کی تذلیل و تحقیر، کوڑوں کی پھنکار اور انسانی لہو کی بو آتی ہے۔

کالا پانی ان مظلوم مجاہدین کا تذکرہ، جنہوں نے اُمڈتی ہوئی تاریکیوں میں اپنے خون سے جہاد کی مشعلیں جلائیں۔

کالا پانی اسلامی جذبوں، فولادی قوتوں اور جانگسل تصادموں کی ایمان افروز حکایت۔

کالا پانی انگریزی دورِ حکومت میں جبر و تشدد کے ہتھکنڈوں، تفتیش کے پُر اسرار حربوں اور جیل کی کال کوٹھڑیوں ـــــ اور ان کے مقابلے میں ناتواں جسموں مگر عزم و ایمان اور جرأت و استقلال کی چٹانوں کی آپ بیتی۔

کالا پانی ان ایام کا تذکرہ، جب راہِ محبت کے راہرو دار کا پھندہ چُومنے کے لیے یوں بے قرار ہو گئے، جیسے کوئی عاشقِ زار وصالِ محبوب کیلئے بے چین ہو جاتا ہے تو انگریزوں نے ان کی پھانسی کی سزا کو کالا پانی کے آلام و مصائب میں بدل دیا۔

کالا پانی اسی جہنم میں بسر کیے ہوئے ۱۸ سال کی سرگزشت ہے!

ملنے کا پتہ

طارق اکیڈمی، لائل پور